www.urducouncil.nic.in

اگست 2025 ، قیمت :- 15 ₹

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly **BACHON KI DUNIYA**, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

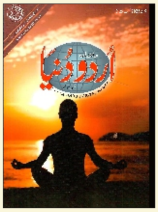

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 25 روپے، سالانہ: 240 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

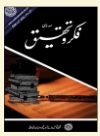

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 13 شمارہ: 08 اگست 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم۔محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000
شعبہ ادارت:49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /15 روپے، سالانہ/145 روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی- 110066
فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون:040-24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
یومِ آزادی		
پندرہ اگست آیا	فراق جلال پوری	07
بچوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کریں	احسان عالم	08
آزادی پر رباعیات	ممتاز انور	10
یومِ آزادی: ایک عظیم دن کی یادگار	شاہین تاج	11
آزادی کا متوالا	تبسم سحر	13
ہم اس زمیں کو ایک روز آسماں بنائیں گے	ادارہ	14
مضامین		
کاغذ کے ایک روپے کی کہانی	سید پرویز قیصر	15
غریب کسان کا بیٹا جو عظیم سائنس داں بنا	احفاظ الحق انصاری	18
رابندر ناتھ ٹیگور اور نوبل پرائز	صفدر حسین	20
نظمیں		
بادل	شیدا بگھونوی	23
برسات کا موسم	شمیم انجم وارثی	23
پانی برسا	فہیم احمد	24
بارش لے کر آیا بادل	کلیم نوری فیروزآبادی	25
کتنا خاص ہے اپنا آم	شاہد اقبال	26
چنچل بچے	شمس النسا کرن	27
اٹل بہاری باجپئی	حبیب سیفی	28
کہانیاں		
بچوں کی انوکھی دنیا	پرویز شہریار	29
رنگ برنگی چھتری اور پتنگ	طٰہٰ نسیم	32
شناخت	صابر پرواز	34
پنجرے والی نانی	شیخ حسین	37
ماں کی قربانی	شرمین انصاری	43
آؤ تمھیں چاند پر لے جائیں	گل افشاں	45
فیضان اور اونٹ	شاداب ابراہیم	49
نئی اڑان	وسیم جیلانی	51
سائنس		
سبرامنیم چندر شیکھر	احرار حسین	53
صحت		
کیلے کی غذائی اہمیت	محمد خلیل	56
واقفیت عامہ		
تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات	ادارہ	59
ننھے فنکار		
پینٹنگ		60

پیارے بچو! ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، یہاں ہر علاقے کا الگ موسم ہوتا ہے، ایک ہی وقت میں کہیں ٹھنڈ پڑتی ہے تو کہیں گرمی اور کہیں برسات ہوتی ہے۔ شمالی ہندوستان کا موسم جنوبی ہندوستان سے مختلف ہوتا ہے، اسی طرح پہاڑی علاقوں کے موسم بھی الگ ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں بنیادی طور پر چار اہم موسم پائے جاتے ہیں، موسم گرما، موسم برسات، موسم خزاں اور موسم سرما۔ موسم گرما ہندوستان میں مارچ سے شروع ہوکر جون تک رہتا ہے۔ اس موسم میں درجہ حرارت 40 سے 45 ڈگری اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ رہتا ہے۔ ان مہینوں میں اتر پردیش، بہار، راجستھان، مدھیہ پردیش اور دہلی وغیرہ میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ اس موسم میں گرمی سے بچنے کے لیے لوگ مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

برسات کا موسم جولائی سے ستمبر تک رہتا ہے، لیکن ہندوستان کے کچھ صوبوں میں یہ موسم وسط جون سے بھی شروع ہوجاتا ہے۔ موسم برسات کو مانسون کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس موسم کا کسان بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ اگر بارش زیادہ ہوتو پھر یہ سیلاب کی صورت میں تباہی مچادیتی ہے، لوگ بے گھر ہوجاتے ہیں اور انھیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر بارش کم ہوتو فصل تو خراب ہوتی ہی ہے ساتھ ہی خشک سالی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

بچو! آپ نے غور کیا ہوگا کہ جب بارش ہوتی ہے تو اس سے پہلے آسمان میں بادل چھا جاتے ہیں، یہ بادل کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر بادلوں کی اقسام کو چار حصوں سیرس کلاؤڈ (Cirrus Cloud)، کیومیلس کلاؤڈ (Cumilus Cloud)، اسٹریٹس کلاؤڈ (Stratus Cloud) اور نمبس کلاؤڈ (Nimbus Cloud) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ سائرس بادل باریک اور ہلکا ہوتا ہے، یہ اونچائی پر ہوتا ہے اور خوشگوار تبدیلی کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ کیومیلس روئی کی طرح ہلکا ہے۔ یہ درمیانی اونچائی پر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ طوفان بھی لے کر آتا ہے۔ اسٹریٹس دھند جیسا بادل ہوتا ہے، یہ زیادہ اونچائی پر نہیں ہوتا ہے اور یہ ہلکی بوندا باندی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ نمبس گھنا اور سیاہ بادل ہوتا ہے اور یہ مسلسل بارش، برف باری یا پھر طوفان کی نشاندہی کرتا ہے۔

موسم خزاں اکتوبر سے نومبر تک رہتا ہے۔ یہ بڑا سہانا موسم ہوتا ہے، درجہ حرارت میں کمی ہوجاتی ہے اور درخت کے پتے گرنے اور رنگ بدلنے لگتے ہیں۔ اس موسم میں سیب اور انار وغیرہ کثرت سے ملتے ہیں۔

موسم سرما عام طور پر دسمبر سے شروع ہوکر فروری تک رہتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں اس مہینے میں ٹھنڈ رہتی ہے۔ ہماچل پردیش، کشمیر، پنجاب اور دہلی وغیرہ کے علاقے ٹھنڈ سے متاثر ہوتے ہیں اس کے برخلاف جنوبی ہندوستان جیسے مدراس، بنگلورو وغیرہ کا موسم خوشگوار رہتا ہے۔ اس مہینے میں شمالی ہندوستان کے لوگ جنوب میں گھومنے پھرنے اور سیر وسیاحت کے لیے جاتے ہیں۔

پیارے بچو! موسم خواہ کوئی بھی ہو ہمیں اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ ہر موسم کی اپنی خصوصیات ہیں، جولائی کے مہینے میں ہندوستان کے اکثر علاقوں میں بارش ہوتی ہے، اس میں اپنی صحت کا خیال رکھتے ہوئے پڑھائی پر توجہ دیں اور فرصت کے اوقات کا صحیح اور اچھے طریقے سے استعمال کریں۔

آپ کا

شمس اقبال

قارئین

ڈاک خانہ

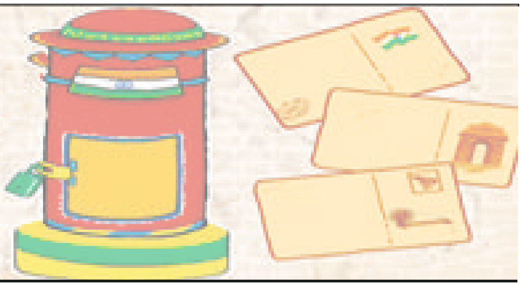

’بچوں کی دنیا‘ نہ صرف بچوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہے بلکہ ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں بھی نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ میں کئی سالوں سے ’بچوں کی دنیا‘ کا مستقل قاری ہوں اور ہر ماہ اس کا بے چینی سے انتظار کرتا ہوں۔ اس رسالے کی ہر اشاعت میں کچھ نہ کچھ نیا، مفید اور سبق آموز ہوتا ہے۔ خاص طور پر آپ کی کوشش ہوتی ہے کہ بچوں کی عمر، مزاج، دلچسپیوں اور تعلیمی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے مواد شائع کیا جائے، جو کہ قابل تعریف ہے۔ اس رسالے میں شامل کہانیاں، نظمیں، معلوماتی مضامین، سائنسی مواد، تاریخی واقعات، سماجی معلومات اور دلچسپ سوال و جواب کا حصہ بچوں کے لیے نہایت معلوماتی اور متاثر کن ہوتا ہے۔

’بچوں کی دنیا‘ کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ صرف تفریح کا سامان فراہم نہیں کرتا بلکہ تعلیمی اور اخلاقی پیغام بھی دیتا ہے۔ آج کے دور میں جب بچے الیکٹرانک میڈیا کی طرف زیادہ مائل ہو رہے ہیں، ایسے میں بچوں کا کتابوں اور رسالوں سے تعلق قائم رکھنا نہایت اہم ہے۔ ’بچوں کی دنیا‘ اس تعلق کو مضبوط کرنے میں ایک پل کا کام کر رہا ہے۔ اس کے صفحات میں موجود رنگین تصویریں، جاذب نظر سرخیاں اور صاف ستھری زبان بچے کو مطالعے کی طرف راغب کرتی ہیں۔

ایک اور خوبی جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے نئے لکھنے والوں کو بھی اظہار کا موقع دیا ہے۔ یہ نہ صرف بچوں کے اندر چھپی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے بلکہ انھیں لکھنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ کئی بچے ایسے ہوتے ہیں جو صرف پڑھنے کے ساتھ ساتھ

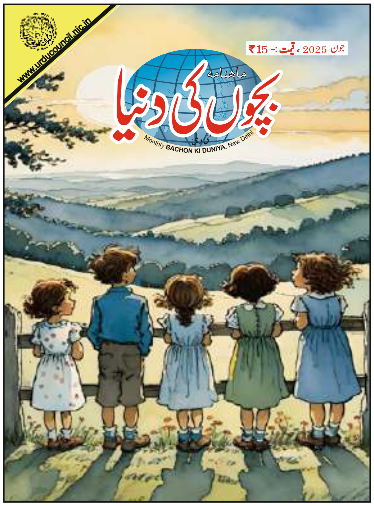

لکھنے کا شوق بھی رکھتے ہیں، ’بچوں کی دنیا‘ ان کے لیے ایک بہترین پلیٹ فارم ہے۔ بچوں کو خود اعتمادی حاصل ہوتی ہے جب ان کا نام یا تصویر رسالے میں شائع ہوتی ہے۔ یہ ایک مثبت تربیتی طریقہ ہے جس سے بچوں کی شخصیت نکھرتی ہے۔

آخر میں ایک بار پھر ’بچوں کی دنیا‘ کی ترقی، مقبولیت اور مسلسل اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ یہ رسالہ یونہی علم و ادب کی روشنی بانٹتا رہے اور آنے والی نسلوں کی فکری و اخلاقی تربیت کرتا رہے۔ اللہ اس رسالے کو مزید کامیابیوں سے نوازے۔

جاوید رئیس، دہرہ دون، اتراکھنڈ

’بچوں کی دنیا‘ برائے ماہ جون 2025 موصول ہوا۔ سرورق پر ہرے بھرے تختوں، سبزہ زاروں اور ابھرتے سورج کی ملائم کرنوں کو کچھ بچے اپنی حد بندی سے نظارہ کر رہے ہیں جہاں صبح کی سیر صحت کے لیے مفید ہے وہیں یوگا بھی اچھی صحت کی عمدہ دلیل ہے۔

اداریے میں بتایا گیا ہے کہ 21 جون 2015 سے عالمی طور پر یوگا ڈے منایا جا رہا ہے۔ یوگا ایک ایسی ورزش ہے جو دل و دماغ کو صحت مند بناتی ہے۔ اس لیے اسے دن میں کم سے کم پندرہ منٹ ضرور کرنا چاہیے۔ یوگا کے بارے میں مزید معلومات جناب فہیم اشرف نے اپنے مضمون ’یوگا سے دوستی بیماریوں سے نجات‘ میں دی ہے۔ اس میں مضمون نگار نے یوگا کی اہمیت، تاریخی پس منظر، اقسام، فوائد وغیرہ سے واقف کرایا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی اچھے اچھے مضامین اس میں شامل ہیں جیسے ’آم کے کرشماتی فائدے‘ ان کے علاوہ ’گرمیاں آ گئیں‘، ’نظر انداز کر دو‘، ’مچھلی کے بچے‘، ’بیماریوں سے تحفظ‘ وغیرہ وغیرہ۔ پڑھتے رہیے اور کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتے رہیے۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری، بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ،
چھترپتی سنبھاجی نگر، مہاراشٹر، موبائل: 9604957100

ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ جون 2025 کے شمارے کے سرورق پر چھپی تصویر ہر بار کی طرح اس بار بھی بہت اچھی لگی، پورا شمارہ بغور مطالعہ کیا۔ ’ماشاء اللہ ہر نیا پرچہ پہلے سے بہترین معلوم ہوتا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ ہمیشہ جاری و ساری رہے اور نظر بد سے محفوظ رہے آمین!

اداریے میں ڈاکٹر شمس اقبال صاحب نے یوگا اور اچھی صحت کے تعلق سے بہت ہی سبق آموز باتیں بتائی ہیں۔ یہ بتاتے ہوئے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے اسکول کی لائبریری میں رسالہ ’بچوں کی دنیا‘ کی خاص جگہ بن گئی ہے، سبھی طالبات دیگر کتابوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی دنیا کا بھی شوق سے مطالعہ کرتے ہیں اور نظم کہانی مضامین وغیرہ لکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ جیسے پچھلے مئی 2025 کے شمارے میں شامل نظم ’پانی ہی جیون ہے ہمارا‘ مصباح خان بارہویں جماعت کی شائع ہوئی ہے۔

رفیع الدین ناصر کا مضمون ’آم کے کرشماتی فائدے‘ بے حد پسند آیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آم ہماری صحت کے لیے کتنا مفید ہے۔ ’یوگا سے دوستی بیماریوں سے نجات‘ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ صحت کے متعلق مزید معلومات فراہم ہوئی۔ ’علم کی اہمیت‘ واقعی کتابیں ہماری شخصیت کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ’ماحول کو بچائیں‘، ’پھول پودوں کا دوست‘ وغیرہ ماحولیاتی مضامین سبق آموز ہیں۔ شاعری کے حصے میں ’یہ سوچتے ہیں پیہم‘ بہت عمدہ ہیں اس کے علاوہ استادِ محترم جاوید رانا سر کی نظم ’نظر انداز کرو‘ بہت اچھی لگی یہ شعر بے حد پسند آیا۔

دیگر نظمیں دلکش و عمدہ ہیں۔ تمام کہانیاں دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ’مچھلی کے بچے‘ جسے زاہدہ خاتون نے بہت ہی بہترین انداز میں لکھا ہے۔ مینڈک کے بارے میں سائنسی معلومات بہترین طریقے سے ملی۔

ثمینہ بانو محمد افضال، خانقاہ وارڈ، برہانپور مدھیہ پردیش

یومِ آزادی

پندرہ اگست آیا

فراق جلال پوری

مستی بھری ہواؤ، پندرہ آگست آیا!
بھارت کے گیت گاؤ، پندرہ آگست آیا
''سارے جہاں سے اچھا، ہندوستاں ہمارا''
قومی ترانہ گاؤ، پندرہ آگست آیا!
جس گلستاں کو باپو نے اپنے خوں سے سینچا
اُس کو سنواریں، آؤ، پندرہ آگست آیا!
بھارت کی آن پر جو قربان ہوگئے ہیں!
گیت ان کے گنگناؤ، پندرہ آگست آیا!
جو نفرتوں کی رُت میں، الفت کی چھاؤں بخشیں
پیڑ ایسے کچھ لگاؤ، پندرہ آگست آیا!
آزادیوں کے یہ دن، یوں ہی رہیں سلامت
مانگیں دعائیں آؤ، پندرہ آگست آیا!
موسم بہار کا ہے، یہ دن تو پیار کا ہے
نفرت کو بھول جاؤ، پندرہ اگست آیا!
ہے ایکتا کی دولت، طاقت فراق اپنی
مضبوط اسے بناؤ، پندرہ اگست آیا!

■

Firaq Jalalpuri
Mohalla: Qazipura
Post: Jalalpur
Distt.: Ambedkar Nagar-224149 (UP)
Mob.: 9758772746
firaqahmad56@gmail.com

احسان عالم

بچوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کریں

حب الوطنی کا جذبہ انسان کی فطرت میں شامل ہے۔انسان تو انسان، جانور تک جہاں رہتے ہیں اس جگہ سے ایک خاص انسیت ومحبت رکھتے ہیں۔اپنے رہنے کی جگہ پر کسی دوسرے جانوروں کی مداخلت بھی برداشت نہیں کرتے ہیں۔

والدین اور اساتذہ کرام کو چاہیے کہ وہ بچوں کے ذہن میں نرسری سطح سے ہی حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔انھیں آزادی کے متوالوں کی کہانیاں سنائیں، ان کی ہمت، حوصلے اور قربانیوں کی داستان کو ان کے سامنے پیش کریں۔کبھی کبھی حب الوطنی سے متعلق کہانیاں ، ناول اور نظمیں سنائیں۔بچوں سے بھی اس طرح کی کہانیاں سنیں۔

ہر شخص اپنے اپنے انداز میں وطن سے محبت کرتا ہے۔حب الوطنی ہوتی کیا ہے اور یہ کیسے وجود میں آتی ہے؟ حب الوطنی سے مراد اپنے ملک کی چاہت، اپنے وطن سے پیار، ملک سے محبت کا اظہار کرنا ہے۔ یہ ایک پیدائشی فطرت ہے ، یہ ایک جذبہ ہے ، یہ ایک خواہش ہے۔اس کا اظہار تمام ممکنہ طریقوں سے ملک وقوم کی بے

لوث خدمت کرنا ہے۔ حب الوطنی کے جذبے کے تحت ہم اپنے ملک کو دوسرے ممالک پر ترجیح دیتے ہیں ۔ یہ ایک ایسی پیدائشی صفات وخصوصیات ہے جو ہماری عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ہمارے بچے رات دن ٹی وی، کمپیوٹر، موبائل فون اور گیمز میں لگے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں حب الوطنی سے متعلق کہانیاں اور نصیحت آموز سبق پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ایسے میں والدین کی ذمے داری زیادہ اہم ہے کہ اپنے بچوں کی رہبری کریں۔ اگر ٹی وی دیکھنے کے لیے کوئی وقت مقرر ہے تو اسے ایسی فلم دیکھنے کے لیے کہیں جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ اس طرح کے بہت سے ٹپس موبائل فون اور کمپیوٹر پر بھی موجود ہیں۔ بچوں کی صحیح نشاندہی کریں تا کہ ان میں اس سے متعلق دلچسپی قائم ہو سکے۔

مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، رام پرساد بسمل، بھگت سنگھ، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کے اقوال بچوں کو سنائیں اور اس پر عمل کرنے کی تاکید کریں۔

کچھ خامیاں نصابی کتابوں میں بھی ہیں۔ لٹریچر کی کتابوں مثلاً ہندی، اردو، انگریزی میں حب الوطنی سے متعلق زیادہ سے زیادہ باتیں نصاب میں داخل کی جانی چاہیے۔

بچو! اگر ہم آزادی سے قبل اپنے ملک ہندوستان کے حالات پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ انگریزوں نے یہاں طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ قابل مبارکباد ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنے عزم وحوصلے کے بل پر بے شمار قربانیاں دیں، تکلیفیں اٹھائیں لیکن ہمت نہ ہاری اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد ہی دم لیا۔ ملک کو غلامی کے پنجے سے نکال کر آزادی سے ہم کنار کرانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اساتذہ کرام کا فریضہ ہے کہ وہ بچوں کو صرف یہ نہ بتائیں کہ آزادی کے دیوانوں کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی ؟ ان کے مزارات کہاں ہیں؟ بلکہ یہ بات ذہن نشیں کرانے کی ضرورت ہے کہ ان عظیم ہستیوں نے کیا قربانیاں دیں ، آزادی کی لڑائی میں ان کی خدمات کیا ہیں۔ ہمیں ان سے سبق لیتے ہوئے خود میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرنا چاہیے۔

بچوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے اپنی نظم کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ کریں۔

ہم اِس پر ناز کرتے ہیں ہمارا دیش ہے بھارت
ستائش کے گُہر کا تاج ہم اس کو پنھاتے ہیں
کچھ اِس پر آنچ آئے ہم گوارا کر نہیں سکتے
کہ جاں دے کر وطن کی آبرو کو ہم بچاتے ہیں
انھیں کو پیش بھی کرتے ہیں آج اشکوں کے نذرانے
شہیدانِ وطن کی عظمتوں کے گیت گاتے ہیں
وطن پہ جاں لٹائی تھی وطن کے جن سپوتوں نے
وہ دیوانے، وہ متوالے، وہ عاشق یاد آتے ہیں
محبت بھی وطن سے ہم کو ہے احسان کچھ ایسی
ترانہ اس کی عظمت ہی کا سنتے اور سناتے ہیں

■

Dr. Ahsan Alam
Near Al-Hira Public School
Moh: Raham Khan, P.O. Lal Bagh
Darbhanga - 846004 (Bihar)
ahsanalam16@yahoo.com

آزادی پر رباعیات

ممتاز انور

جذبوں میں بیاں رنگ ہے آزادی کا
آزاد ہیں، ہاں رنگ ہے آزادی کا
حاضر ہیں رباعیات جو آزادی پہ
ان میں بھی جواں رنگ ہے آزادی کا

ہر صبح، ہر اک شام ہے، آزادی سے
جینے کا بھی پیغام ہے، آزادی سے
ہے دھندلی ہر اک سمت غلامی کی لکیر
خوشیوں کا چلن عام ہے، آزادی سے

ہر دل کی یہ آواز ہے آزادی پر
سانسوں کا فدا ، ساز ہے آزادی پر
پرکھوں نے ہمیں دی ہے سجا کر انور
ہم سب کو بہت ناز ہے آزادی پر

میدان وہ جو سر کیا آزادی نے
بہتر سے بھی بہتر کیا آزادی نے
کھاتے ہیں قسم چھو کے وطن کی مٹی
مٹی کو معطر کیا آزادی نے

ایسا ہے کہ ہوتا گیا آزادی تک
بڑھتا رہا، بڑھتا گیا آزادی تک
تاریخ ہے، تاریخ کا حصہ بھی ہے
وہ قافلہ،جو آ گیا آزادی تک

اخلاق کا اعلان بنی آزادی
تہذیب بنی، شان بنی آزادی
انسان کو انساں سے ملانے کے لیے
اس ملک کی پہچان بنی آزادی ■

Mumtaz Anwar
66- A, N.R.Adhikary Road
Kamarhati, Kolkata -700058 (West Bengal)
Mob.: 9748830729
anwarmumtaz.m.a@gmail.com

شاہین تاج

یومِ آزادی: ایک عظیم دن کی یادگار

یومِ آزادی ہر ملک کے لیے ایک خاص دن ہوتا ہے، جو آزادی کی نعمت، قربانیوں کی یاد اور قومی شعور کو اجاگر کرتا ہے۔ ہندوستان میں ہر سال 15 اگست کو یومِ آزادی منایا جاتا ہے۔ یہ وہ دن ہے جب ہمارا پیارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اور ہم نے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے سانس لی۔ یہ دن ہمیں اپنے ملک سے محبت، قربانی، اتحاد اور ترقی کے عزم کی یاد دلاتا ہے۔

ہندوستان پر کئی صدیوں تک بیرونی طاقتوں نے حکومت کی۔ انگریزوں نے 1757 میں بنگال کی جنگِ پلاسی جیتنے کے بعد آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قبضہ جمالیا۔ انگریز حکومت نے عوام پر کئی سخت قوانین نافذ کیے، ان کے حقوق سلب کیے اور انھیں تعلیم، تجارت اور ترقی سے محروم رکھا۔ ملک کے وسائل کو لوٹا گیا، اور عام انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔

قربانیاں اور شہادتیں: ہزاروں لوگوں نے آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔ بھگت سنگھ، راج گرو، اور سکھ دیو نے مسکرا کر تختۂ دار کو گلے لگایا۔ اشفاق اللہ خان، رام پرساد بسمل اور دوسرے نوجوانوں نے قوم کے لیے اپنی جانیں نچھاور کیں۔ ان کی قربانیاں ہمارے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں اور ہمیں اپنے فرائض یاد دلاتی ہیں۔

15 اگست 1947 کا دن: آخرکار، طویل جدوجہد، قربانیوں اور عوامی اتحاد کی بدولت 15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہوا۔ وہ دن خوشی، امید اور نئی شروعات کا دن تھا۔ دہلی کے لال قلعے سے پنڈت جواہر لال نہرو نے پہلی بار قومی پرچم لہرایا اور قوم سے خطاب کیا۔ انھوں نے آزادی کے بعد ایک بہتر، خوش حال اور مساوات پر مبنی بھارت کی بنیاد رکھنے کا وعدہ کیا۔

یومِ آزادی کی تقریبات: ہر سال 15 اگست کو پورے ملک میں یومِ آزادی جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ اسکولوں، کالجوں، دفاتر اور سرکاری عمارتوں پر قومی پرچم لہرایا جاتا ہے۔ قومی ترانہ گایا جاتا ہے اور رنگا رنگ پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔

حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے تقریریں، ترانے، ڈرامے، اور خاکے پیش کیے جاتے ہیں۔ دارالحکومت دہلی میں وزیرِاعظم لال قلعے پر قومی پرچم لہراتے ہیں اور قوم سے خطاب کرتے ہیں۔ یہ تقریب ٹی وی اور ریڈیو پر براہ راست نشر کی جاتی ہے۔

ہمارا قومی پرچم: شان، پہچان اور فخر کی علامت: ہندوستان کا قومی پرچم ہماری آزادی، اتحاد اور قومی خودداری کی علامت ہے۔ اسے 'ترنگا' کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں تین

رنگ ہوتے ہیں: زعفرانی، سفید اور سبز۔ اوپر کا زعفرانی رنگ ہمت، قربانی اور جذبے کو ظاہر کرتا ہے۔ درمیان کا سفید رنگ امن اور سچائی کی علامت ہے، جب کہ نچلا سبز رنگ ترقی، خوشحالی اور زمینی رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔

درمیان میں نیلے رنگ کا اشوکا چکر ہے جس میں 24 تیلیاں ہوتی ہیں۔ یہ چکر قانون، انصاف اور مسلسل حرکت کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہمارے قومی پرچم کو 22 جولائی 1947 کو آئینی طور پر قبول کیا گیا، اور 15 اگست 1947 کو پہلی بار لال قلعے پر لہرایا گیا۔ قومی پرچم کی عزت ہم پر فرض ہے، اس لیے اسے درست طریقے سے لہرائیں اور کبھی بھی زمین پر نہ گرنے دیں۔

بچوں کا کردار: روشن مستقبل کے معمار: پیارے بچو! آزادی کی حفاظت صرف بڑوں کی ذمے داری نہیں، بلکہ آپ سب کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ آپ ہی وہ ننھے چراغ ہیں جو کل ملک کو روشنی دیں گے۔ آپ کی تعلیم، اخلاق، نظم و ضبط اور حب الوطنی کا جذبہ ہی ملک کے مستقبل کو سنوار سکتا ہے۔

آپ کو چاہیے کہ اسکول میں محنت سے پڑھیں۔ سچ بولیں اور صاف ستھرا رہیں۔ ماحول کو صاف رکھیں۔ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہ کریں۔ آپسی اتحاد قائم کریں۔ تمام مذاہب کا احترام کریں۔ بڑوں کا ادب و چھوٹوں پر شفقت کریں۔

یاد رکھو! جیسے بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خان، چندر شیکھر آزاد نے کم عمری میں ہی ملک کے لیے قربانیاں دیں، ویسے ہی آپ بھی اپنے علم، کردار اور محنت سے ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔ آپ کے خواب، آج کا مطالعہ اور کل کی کامیابیاں ہی ہمارا فخر بنیں گی۔

یومِ آزادی کی اہمیت: یومِ آزادی ہمیں صرف خوشی کا دن نہیں، بلکہ ذمے داری اور خود احتسابی کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم نے آزادی کے بعد کیا پایا؟ کیا ہم اپنے ملک کو تعلیم، صفائی، صحت، ترقی، مساوات، عدم تشدد اور انصاف کے میدان میں آگے لے جا سکے ہیں؟

یہ دن ہمیں اتحاد، بھائی چارے، قومی یکجہتی، حب الوطنی، اور قربانی کا درس دیتا ہے۔ ہمیں اپنے ملک کو بہتر بنانے کے لیے ایمانداری، محنت اور خدمت کا جذبہ اپنانا چاہیے۔

یومِ آزادی ہمیں ماضی کی یاد دلاتا ہے، حال میں ہمیں خبردار کرتا ہے اور مستقبل کے لیے ہمیں تیار کرتا ہے۔ ہمیں اس دن کو صرف تقریبات تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اپنے کردار، رویے اور عمل سے ثابت کرنا چاہیے کہ ہم سچے محبِ وطن ہیں۔ آزادی ایک قیمتی نعمت ہے، اس کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔

آئیں! ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم اپنے ملک کو علم، اتحاد، انصاف، عدم تشدد اور ترقی کی راہوں پر لے کر چلیں گے۔

زندہ باد! ہندوستان!

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے!

■

Shahin Taj
Plot No. 1011/1, Shastripuram
Shivrampally, Hyderabad-500052 (Telangana)
Email:shahintaj891@gmail.com

آزادی کا متوالا

تبسم سحر

بچو! میں ہوں ایک پرندہ
خوش ہوں قید سے لوٹا زندہ
شوق سے مجھ کو پالا گیا تھا
اک پنجرے میں رکھا گیا تھا
صاف اور ستھرا تھا وہ پنجرہ
گھر سے اچھا تھا وہ پنجرہ
اس کے بیچ میں جھولا بھی تھا
جو کہ ہلتا ڈلتا بھی تھا
ہر موسم کا پھل ملتا تھا
پیالیوں میں جل ملتا تھا
اپنی خوشی سے ٹب میں نہاتا
اچھا پیتا اچھا کھاتا
بچے آتے بوڑھے آتے
پیار سے چیزیں مجھے کھلاتے
چیز یہاں تھی ہر اک حاصل
پھر بھی نہیں لگتا تھا دل
یہاں کہاں وہ آزادی تھی
یاد وطن کی تڑپاتی تھی
دیکھ کے مجھ کو خوش ہوتا تھا
پاتا فسردہ تو روتا تھا
خواہش تھی آزاد رہوں میں
اڑتا پھروں دلشاد رہوں میں
گو چھوٹا تھا نیک بڑا تھا
تڑپ تھی جس میں ایسا دعا تھی
آزادی کا متوالا تھا
آزادی کا رکھوالا تھا
بولا کسی سے نہیں ڈروں گا
تمھیں ابھی آزاد کروں گا
اب نہ کسی سے گھبراؤ تم
اڑ کر اپنے گھر جاؤ تم
ملو خوشی سے ہر ساتھی سے
بھائیوں بہنوں، ابو، امی سے
آزادی کا جشن مناؤ
اُڑو مزے سے، مزے اڑاؤ
دعا کرو آزاد رہیں سب
شاد رہیں، آباد رہیں سب

■

Tabassum Sahar
Novel Heights, Flat No.12
3rd Floor, Near Delta Royal
Satvik Nagar, Pakhal Road
Nasik- 422011 (Maharashtra)
Mob.:8888315125
tabassumsaher16@gmail.com

ہم اس زمیں کو ایک روز آسماں بنائیں گے

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔اس سے تحریر وتقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے،خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔(ادارہ)

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامان مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

—برج نرائن چکبست

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

—لال چند فلک

نہ پوچھو ہم سفرو مجھ سے ماجرائے وطن
وطن ہے مجھ پہ فدا اور میں فدائے وطن

—مردان علی خاں رانا

نہ ہو سکے گا کبھی محترم جہاں میں تو
جو تیرے دل میں نہیں احترام آزادی

—احمق پھپھوندوی

لہو وطن کے شہیدوں کا رنگ لایا ہے
اچھل رہا ہے زمانے میں نام آزادی

—فراق گورکھپوری

وطن کی پاسبانی جان وایماں سے بھی افضل ہے
میں اپنے ملک کی خاطر کفن بھی ساتھ رکھتا ہوں

—نامعلوم

خوں شہیدان وطن کا رنگ لا کر ہی رہا
آج یہ جنت نشاں ہندوستاں آزاد ہے

—امین سلونوی

وطن کے جاں نثار ہیں وطن کے کام آئیں گے
ہم اس زمیں کو ایک روز آسماں بنائیں گے

—جعفر ملیح آبادی

اس ملک کی سرحد کو کوئی چھو نہیں سکتا
جس ملک کی سرحد کی نگہبان ہیں آنکھیں

—نامعلوم

آزادی وطن کا دلوں میں خمار ہے
یہ پندرہ اگست کا دن یادگار ہے

—لئیق صدیقی

کاغذ کے ایک روپے کی کہانی

سید پرویز قیصر

ہندوستان میں 1917 سے پہلے تک چاندی کا ایک روپیہ چلتا تھا۔ باقی سکے بھی چاندی یا دیگر دھات کے ہوتے تھے۔اس زمانے میں ایک روپیہ سے بڑے سکے کا زیادہ چلن نہیں تھا۔سونے کی اشرفی کی کوئی ایک مقررہ قیمت نہیں تھی۔

شیرشاہ سوری نے 17 مئی 1538 سے 22 مئی 1545 تک ہندوستان پر حکومت کی اور 178 گرین (لگ بھگ ساڑھے گیارہ گرام) کا چاندی کا ایک روپے کا سکہ جاری کیا۔ مغلوں کے دور حکومت میں بھی چاندی کا ایک روپے کا سکہ چلتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے 19 اگست 1757 کو کلکتہ (اب کولکاتہ) سے ایک روپے کا چاندی کا سکہ جاری کیا تھا۔ یہ سکہ کولکاتہ کی ٹکسال میں بنایا گیا تھا۔اس سکہ کا وزن لگ بھگ دس گرام تھا۔اس وقت اس سکے کی بازار میں قیمت کم ازکم تین ہزارروپے ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1835 میں چاندی کا ایک روپے کا سکہ جاری کیا تھا۔تب کنگ ولیم سوئم برطانیہ کے بادشاہ تھے۔ 11.66 گرام وزنی اور 30.5 ملی میٹر گولائی اور 1.9 ملی میٹرموٹائی والے اس سکے پرایک جانب کنگ ولیم سوئم کی تصویرتھی اور دوسری جانب ایسٹ انڈیا کمپنی اور سال درج تھا۔

کوئن وکٹوریہ نے 1837 میں برطانیہ کی باگ دوڑ سنبھالی۔ برطانیہ کے قوانین کے مطابق بادشاہ کی سب سے بڑی اولاد کوحکومت کی باگ ڈور سپرد کی جاتی ہے۔ ان کے نام سے جاری ایک روپے کے سکے میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہندوستان دونوں درج تھے۔کیونکہ وہ 1901 تک برطانیہ کی ملکہ رہی تھیں۔ ان کی تصویر کے ساتھ جاری سکے کا وزن اور موٹائی تو پچھلے سکے کے برابر تھی مگر گولائی کچھ زیادہ یعنی 30.78 ملی میٹرتھی۔اس وقت اس سکے کی کم سے کم قیمت دو ہزارروپے ہے۔

کوئن وکٹوریہ کی وفات کے بعد 22 جنوری 1901 کوایڈورڈ ہفتم برطانیہ کے بادشاہ بنے۔ان کے نام سے

جاری سکہ پچھلے سکے کی طرح تھا۔ سکے کی ایک جانب انگریزی اور اردو میں ایک روپیہ تحریر تھا جب کہ دوسری جانب ایڈورڈ ہفتم کی تصویر تھی۔ اس وقت اس سکے کی کم سے کم قیمت ایک ہزار روپے ہے۔

جارج پنجم کی شبیہ کے ساتھ 1911 میں ایک روپے کا جو چاندی کا سکہ جاری ہوا تھا وہ بھی لگ بھگ سابقہ سکے کی طرح تھا۔ جارج پنجم 1911 اور 1936 کے درمیان برطانیہ کے بادشاہ رہے ان کی حکومت ہندوستان میں بھی تھی۔ اس سکے کی اس وقت کم از کم قیمت ایک ہزار وہے ہے۔ جارج پنجم کے زمانے میں ہی ہندوستانی حکومت نے پہلی مرتبہ کاغذ کا ایک روپے کا نوٹ بھی جاری کیا۔ یہ نوٹ برطانیہ سے چھپ کر آیا تھا اور کاونپور (اب کانپور)، بمبئی (اب ممبئی)، کلکتہ (اب کولکاتہ)، کراچی، لاہور، مدراس (اب چنئی) اور رنگون (اب ینگون) سے جاری کیا گیا۔ 30 نومبر 1917 کو جاری اس نوٹ پر سائمن ایس گوبے، اے سی میک وارٹرس اور ایچ ڈینگ کے دستخط تھے۔

سال 1918 میں جرمنی کا ایک پانی کا جہاز انگلینڈ سے ہندوستان ایک بڑی تعداد میں ایک روپے کے نوٹ لے کر ہندوستان آیا تھا۔ ایک روپے کی نوٹ کی گڈی 25 نوٹوں پر مشتمل تھی اور اس میں نوٹ ایسے لگے ہوئے تھے جس طرح آج کل بینک کی چیک بک ہوتی ہے۔ یکم جنوری 1926 کو یہ روپیہ بند کر دیا گیا تھا۔

کاغذ کے ایک روپے کی ایک جانب جارج پنجم کی شبیہ والے چاندی کے سکے کی تصویر تھی اور ہر نوٹ پر گنتی درج تھی۔ دوسری جانب اردو کے ساتھ سات اور ہندوستانی زبانوں میں ایک روپیہ درج تھا۔ اردو کو سب سے اوپر لکھا گیا تھا جب کہ گجراتی کو سب سے آخر میں جگہ ملی تھی اور گجراتی میں غلط لکھا گیا تھا۔ بعد میں جب دوسری مرتبہ اس نوٹ کی چھپائی ہوئی تو گجراتی کی غلطی کو درست کر لیا گیا۔

اس وقت اس ایک روپے کی قیمت لگ بھگ بیس ہزار روپے ہے اور 25 نوٹوں پر مشتمل گڈی ایک کڑور میں بھی دستیاب نہیں ہے۔ دراصل کسی کے پاس 25 نوٹوں کی مکمل گڈی ہے ہی نہیں۔

ایک روپیہ کے کاغذ کے نوٹ کے بعد بھی چاندی کے ایک روپیے کا سکہ مسلسل چلتا رہا دراصل لوگوں نے کاغذ کے ایک روپے کے نوٹ کو قبول نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے حکومت کو اسے بند کرنا پڑا۔ اس زمانے میں کاغذ اور پرنٹنگ پریس کی کمی بھی تھی، اس لیے بھی ایک روپے کے کاغذ کے نوٹ کو بند کرنا پڑا۔

چاندی کا ایک روپے کے سکے میں پہلے لگ بھگ 99 فیصد چاندی ہوتی تھی جو بعد میں کم ہو گئی اور 1939 میں جارج ہشتم کے زمانے میں جب ایک روپے کا سکہ جاری کیا گیا تو اس میں پچاس فیصد چاندی تھی۔ 1945 تک یہی سکہ چلتا رہا۔ اس وقت بازار میں اس کی کم سے کم قیمت چار سو روپے ہے۔

جارج پنجم کے زمانے میں ایک روپے کا جو نوٹ جاری کیا گیا تھا وہ ہرے رنگ میں تھا اور اس کا سائز دس سینٹی میٹر چوڑا اور پانچ سینٹی میٹر لمبا تھا۔ اس نوٹ کی کم سے کم قیمت اس وقت ایک ہزار روپے ہے۔

ہندوستان کو جب 1947 میں آزادی ملی تو کافی دنوں تک برطانیہ کے نوٹ اور سکے چلتے رہے۔ ہندوستانی

مضمون

حکومت نے جب اپنا پہلا ایک روپے کا نوٹ جاری کیا تو وہ لگ بھگ برطانوی نوٹ کی طرح تھا۔ پہلے نوٹ پر خزانے کی وزارت کے سکریٹری کے دستخط تھے اور اس پر کوئی سال درج نہیں تھا۔ برطانوی بادشاہ کی جگہ اشوک کی تری مورتی نے لے لی تھی۔ اس نوٹ کی قیمت اس وقت مارکیٹ میں آٹھ سو روپے ہے۔

ریزرو بینک آف انڈیا نے دو روپے سے دو ہزار روپے تک کے نوٹ شائع کیے ہیں مگر اس نے کبھی ایک روپے کا نوٹ جاری نہیں کیا۔ برطانوی زمانے سے ایسا ہوتا رہا ہے۔

ہندوستانی حکومت نے 1950 کے بعد ہر سال ایک روپے کا نوٹ جاری کیا ہے۔ اس دوران ایک روپے کا نِکل کا سکہ بھی جاری کیا جاتا تھا مگر وہ زیادہ عام نہیں ہوا۔ اس زمانے میں لوگوں کے لیے کاغذ کا ایک روپیہ زیادہ اچھا تھا۔

گاندھی جی کے صد سالہ پیدائش 1969 میں منائی گئی۔ اس موقعے پر خصوصی نوٹ جاری ہوئے تھے۔ تب سب سے چھوٹا نوٹ ایک کا اور سب سے بڑا سو روپے کا تھا۔ سبھی نوٹوں کی طرح ایک روپے کے نوٹ پر گاندھی جی کی تصویر چھاپی گئی تھی۔ یہ سلسلہ صرف ایک سال تک جاری رہا۔ جتنے نوٹ 1969 میں چھپے تھے وہ مسلسل چلتے رہے جب کہ 1970 میں وہی نوٹ جاری ہوئے جیسے 1968 میں تھے۔

کاغذ کے ایک روپے کے ساتھ ساتھ نِکل اور لوہے کا ایک روپے کا سکہ برابر چلتا رہا۔ 1994 میں ایک روپے کا نوٹ بند کردیا گیا مگر ایک روپے کا سکہ ابھی تک چل رہا ہے۔ مگر اس کا سائز اور دھات میں کافی فرق آگیا ہے۔

ہندوستانی حکومت نے 2015 میں کاغذ کے ایک روپے کا نوٹ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دوبارہ جاری کیا جو 2016 اور 2017 میں بھی جاری کیا گیا۔ یہ نوٹ بازار میں نظر نہیں آیا۔ زیادہ تر لوگوں نے اس نوٹ کو یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ فی الحال 2018 اور 2019 کا کوئی نوٹ ابھی تک بازار میں نہیں آیا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی بیان ہندوستانی حکومت کی جانب سے آیا ہے۔

■

Syed Pervez Qaiser
1407, Qasim Jan Street
Ballimaran
Delhi- 110006
sqaiser@hotmail.com

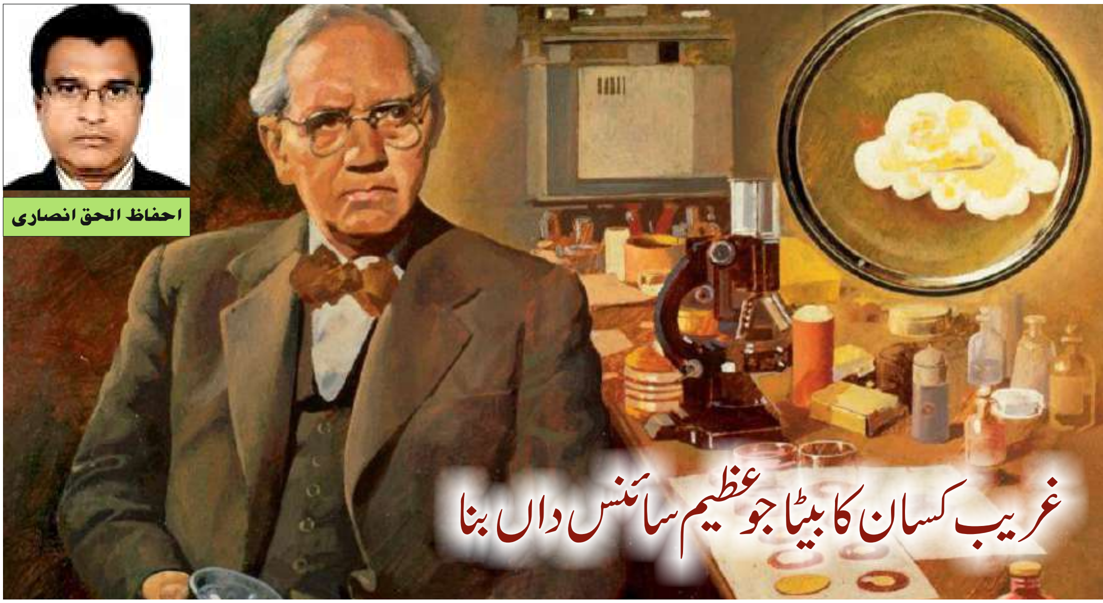

احفاظ الحق انصاری

غریب کسان کا بیٹا جو عظیم سائنس داں بنا

19 ویں صدی کے 80 کی دہائی کی بات ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے ضلع آئرشائر میں ہیو فلیمنگ نام کا ایک غریب کسان اپنے چھوٹے سے جھونپڑے میں رہتا تھا۔ ایک دن اپنے کھیت میں کام کرتے وقت قریب ہی اس نے ایک بچے کی چیخیں سنی۔ فلیمنگ نے اس آواز کی طرف توجہ دی اور قدم بڑھایا تو اس نے دیکھا کہ ایک بچہ دلدل میں کمر تک دھنسا ہوا ہے اور بچاؤ بچاؤ چلا رہا ہے۔ فلیمنگ نے دلدل میں چھلانگ لگا کر اس بچے کو باہر نکالا اور نہلا دھلا کر جانے کو کہا۔ بچہ چلا گیا۔ دوسرے دن وہ کسان کیا دیکھتا ہے کہ اس کے جھونپڑے کے سامنے ایک بہت بڑی کار رائل کیریج آ کر کھڑی ہے اور اس میں سے اس زمانے کے ایک بہت امیر اور برطانیہ کے بڑے سیاستداں لارڈ رینڈولف چرچل باہر نکلتے ہیں اور کسان کے پاس آ کر کہتے ہیں کہ فلیمنگ آپ نے میرے بچے کی جان بچائی ہے اور میں اس عظیم کام کے بدلے آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ جواب میں فلیمنگ صاف صاف کہتا ہے کہ چرچل صاحب یہ انسانیت کا کام ہے اور اس کے لیے میں کوئی پیسوں کا لین دین نہیں کرنا چاہتا۔ چرچل کے بہت اصرار کرنے کے بعد بھی فلیمنگ یہی کہتا ہے کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے، آپ میرے جھونپڑے تک آئے یہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔ دونوں کی گفتگو کے درمیان چرچل، فلیمنگ کے جھونپڑے میں سے ایک بچے کو دوڑتے ہوئے باہر نکلتے دیکھتا ہے۔ چرچل پوچھتا ہے فلیمنگ کیا یہ تمھارا بچہ ہے؟ فلیمنگ کی ہاں سن کر چرچل اس بات پر زور دیتا ہے کہ میرا بچہ جس اسکول کالج میں تعلیم حاصل کرے گا، تمھارا بچہ بھی وہیں تعلیم حاصل کرے گا۔ ہم اس بچے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ لہٰذا چرچل اس بچے کو فلیمنگ کی اجازت سے آگے بڑھانے کی ذمہ داری لیتا ہے اور اسے لندن کے ایک مشہور سینٹ میری میڈیکل کالج میں داخلہ دلاتا ہے۔

آگے جا کر یہ بچہ الیگزینڈر فلیمنگ بنتا ہے۔ جی ہاں، الیگزینڈر فلیمنگ وہی عظیم سائنسداں تھا جو اسکاٹ لینڈ کے شہر ڈارویل میں 6 اگست 1881 میں پیدا ہوا جس نے اپنے انتقال 11 مارچ 1955 سے پہلے کئی سالوں تک سائنسی تحقیق کی اور دنیا پر راج کیا۔ الیگزینڈر فلیمنگ نے سینٹ میری میڈیکل کالج اور ہسپتال کی تجربہ گاہ میں ایک سائنسی تحقیق کے دوران 28 ستمبر 1928 کو Penicillin نام کی پہلی Antibiotic ایجاد کی تھی۔ آج ہمارے درمیان سیکڑوں قسموں کی اینٹی بایوٹکس دستیاب ہیں اور زیادہ تر ڈاکٹر کئی بیماریوں کے علاج کے لیے مریضوں کو یہ دوا استعمال کرنے کی تجویز کرتے ہیں۔

لارڈ رینڈولف چرچل کا وہ بیٹا جسے فلیمنگ نے دلدل سے باہر نکال کر بچایا تھا، وہ پھیپھڑوں کو متاثر کرنے والی بیماری نمونیا کا شکار ہو جاتا ہے اور موت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ وہ بچہ اسی Penicillin نام کی اینٹی بایوٹک کے استعمال سے موت کے منہ سے واپس آ کر صحت یاب ہو جاتا ہے اور آگے جا کر وِنسٹن چرچل بنتا ہے۔ جی ہاں وِنسٹن چرچل وہی ہستی ہے جو پہلی مرتبہ 1940 سے 1945 تک اور دوسری مرتبہ 1951 سے 1955 تک برطانیہ کے وزیر اعظم کے عہدے پر رہا ہے۔

الیگزینڈر فلیمنگ کی شخصیت کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ 1945 میں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر جب اس زمانے کی مشہور و معروف دوا کی کمپنیوں نے الیگزینڈر فلیمنگ کو Penicillin کو پیٹینٹ کرنے کے لیے یعنی دانشورانہ حق دلانے کے لیے کروڑوں ڈالر کے بدلے میں اس کے تیار کرنے کا فارمولا حاصل کرنے کی پیشکش کی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور بلا معاوضہ Penicillin کو اس کا دانشورانہ حق دلایا۔ الیگزینڈر فلیمنگ کے اس عظیم فیصلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری عالمی جنگ میں زخمی ہوئے قریب 20 سے 30 لاکھ سپاہی اسی Penicillin کے استعمال سے صحت یاب ہوئے۔ Penicillin کی ایجاد کی اس کامیابی کی بنا پر الیگزینڈر فلیمنگ اور ان کے ساتھیوں کو 1945 کے ادویات کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔

پیارے بچو! آپ لوگوں کو اس کہانی کے سنانے کا واحد مقصد یہ تھا کہ آپ اسے سننے کے بعد کچھ سبق حاصل کریں، تو آپ سبھی نے یہ سبق حاصل کیا کہ کوئی بھی بھلائی کا کیا ہوا کام پلٹ کر واپس ضرور آتا ہے۔ اس کہانی میں اگر ہیو فلیمنگ نے دلدل سے نکال کر اس بچے کی جان نہیں بچائی ہوتی تو شاید الیگزینڈر فلیمنگ ایک عظیم سائنسداں نہیں بنا ہوتا اور آج Penicillin اور دیگر قسموں کی اینٹی بایوٹکس ہمارے اردگرد آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ Penicillin کیا ہے؟ اس کی اہمیت کیا ہے؟ یہ ساری معلومات آپ سب اس کہانی میں جان چکے ہیں۔ تو بچو ہمیشہ بھلائی کا کام کرتے رہیے اور اپنے ذہن میں یہ یقین پیدا کیجیے کہ ہم جب دوسروں کا بھلا کریں گے تو ہمارا بھلا ہونا ہی ہے۔

■

Dr. Ahfazul Haque Ansari
'Pasban', Near Nagar Panchayat Office
Teacher's Colony, New Yerkheda
Kamptee - 441001 (Maharashtra), Distt.: Nagpur
Mob.: 9890617355
ahfazulhaqueansari@gmail.com

صفدر حسین

رابندر ناتھ ٹیگور اور نوبل پرائز

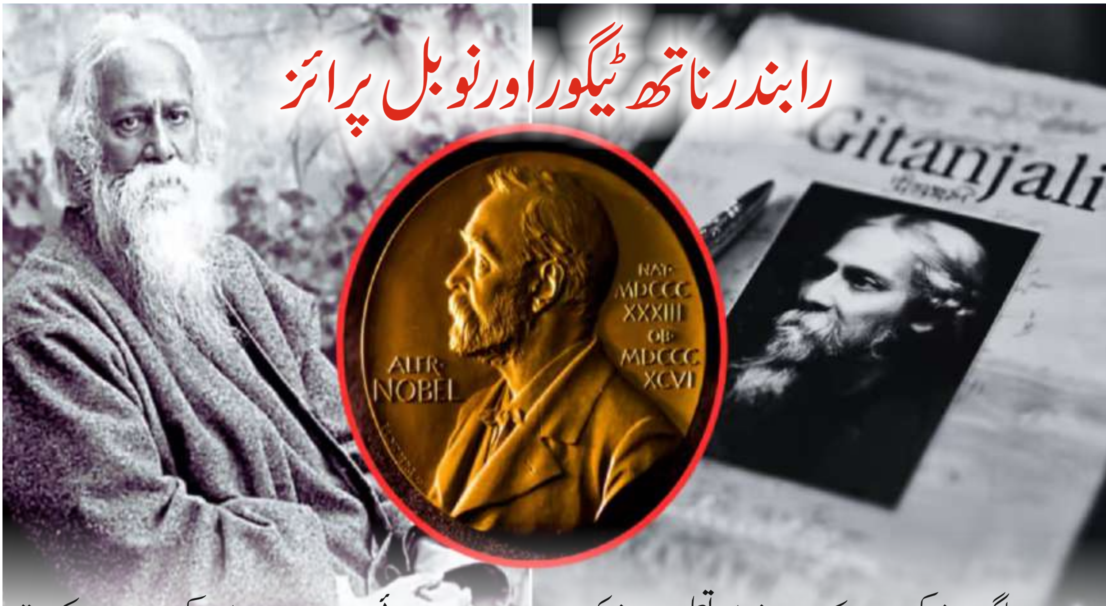

یوں تو ٹیگور اپنی کم عمری کے زمانے میں تعلیم پانے کی غرض سے ایک بار انگلستان جا چکے تھے لیکن انھیں وہاں زیادہ دنوں تک رہنے کا موقع نہ ملا تھا۔ چنانچہ انھوں نے پچاس سال کی عمر میں ایک بار پھر انگلستان جانے کا ارادہ کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ زندگی میں ترقی کرنے کے لیے ہمیں انگریزوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ سفر پر جانے کی تیاریاں ہو چکی تھیں کہ وہ اچانک بیمار ہو گئے اور اس طرح کچھ دنوں کے لیے انھیں رک جانا پڑا۔

ٹیگور آرام کی غرض سے شانتی نکیتن سے شیلدہ چلے گئے۔ بیماری کی حالت میں بھی انھیں بیکار بیٹھنا پسند نہ تھا، چنانچہ وہاں اپنی بنگالی نظموں کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا اور جب وہ بالکل تندرست ہو گئے تو مئی 1912 میں انگلستان کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جہاز میں بھی انھوں نے اپنے ترجمے کے اس کام کو جاری رکھا جو شیلدہ میں پورا نہ ہو سکا تھا۔

لندن پہنچنے پر ٹیگور کی ملاقات ان کے ایک پرانے دوست سے ہوئی جو ہندوستان میں کچھ عرصہ رہ چکے تھے اور ٹیگور کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ اس انگریز دوست کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ جب ٹیگور نے اپنی نظموں کے ترجمے انھیں دکھائے تو وہ پڑھ کر حیران رہ گئے کہ ہندوستان میں بھی اتنے بڑے بڑے شاعر ہیں۔ ٹیگور کی نظمیں اتنی پسند آئیں کہ وہ اسی وقت انھیں 'ایٹس' کے پاس لے گئے جو اس زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ 'ڈبلیو، بی ایٹس' تو پہلے ہی سے ٹیگور کی شاعری سے واقف تھے، نظمیں پڑھ کر انھوں نے بھی ٹیگور کو ایک بہترین شاعر مان لیا۔ ایک دن اسی انگریز دوست نے ٹیگور کی نظمیں اپنے دوسرے دوستوں کو بھی سنانے کے لیے اپنے مکان پر سب کی دعوت کی، وہاں ایٹس نے ٹیگور کی نظمیں پڑھ کر سنائیں جسے سن کر سب نے بے حد تعریف کی ان ہی میں سے ایک اینڈریوز تو ٹیگور کے گہرے دوست بن گئے۔ اینڈریوز دہلی کے ایک کالج میں کئی سال رہ کر انگلستان لوٹے تھے۔ وہ ٹیگور کو اس قدر چاہنے لگے تھے کہ جب وہ

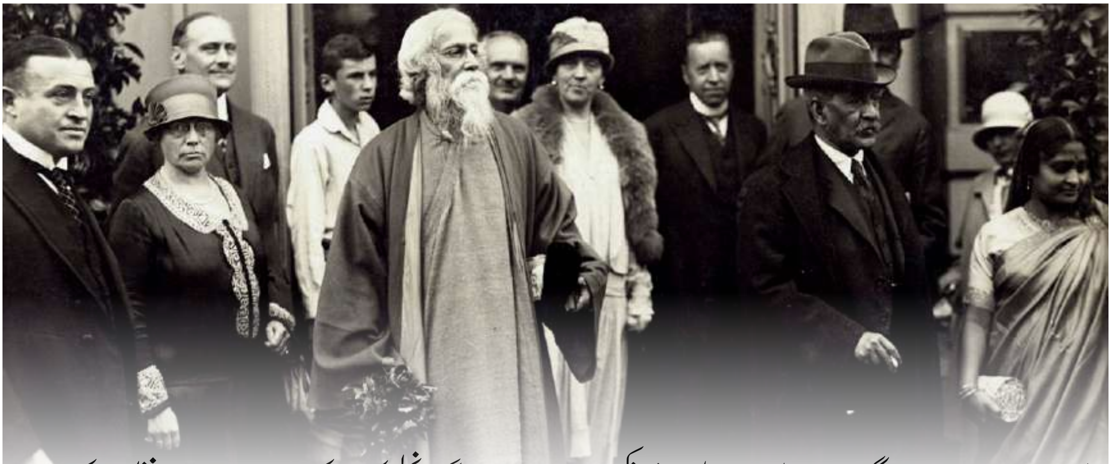

واپس ہندوستان آئے تو ٹیگور سے ملنے کے لیے شانتی نکیتن بھی آئے۔ انھیں یہ اسکول اتنا پسند آیا کہ دو سال بعد دہلی چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے شانتی نکیتن آ گئے اور اسکول کے کام میں ٹیگور کا ہاتھ بٹانے لگے آخر وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

ایٹس بھی چونکہ ایک مشہور شاعر تھے اس لیے انھوں نے ٹیگور کو انگلستان کے پڑھے لکھے لوگوں سے ملایا اور اس کے بعد تو ٹیگور انگلستان میں بہت زیادہ مشہور ہو گئے اور خاص طور پر ان کی نظموں کی کتاب 'گیتا نجلی' کا ترجمہ تو بے حد پسند کیا گیا۔ گیتا نجلی وہی کتاب ہے جس میں ٹیگور نے مذہب اور اپنے دیس کے بارے میں نظمیں لکھی ہیں۔

ٹیگور 1913 میں انگلستان سے پہلی مرتبہ امریکہ گئے۔ وہاں انھوں نے یونیورسٹی میں تقریر کی اور بتایا کہ سادہ زندگی بسر کرنے سے ہی انسان کو سچی خوشی مل سکتی ہے اور ان کے شانتی نکیتن کے اسکول میں بھی یہی تعلیم دی جاتی ہے۔

امریکہ میں چند روز ٹھہرنے کے بعد انگلستان ہوتے ہوئے وہ نومبر 1913 میں ہندوستان واپس آ گئے۔

جب وہ ہندوستان پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کی کتاب 'گیتا نجلی' کو دنیا کی سب سے بہترین نظموں کی کتاب مان لیا گیا اور اس کے لیے انھیں 'نوبل پرائز' دیا گیا۔

نوبل پرائز دنیا کا سب سے بڑا انعام ہے۔ آج سے تقریباً 65 سال پہلے سویڈن کے ایک بڑے سائنسداں الفریڈ نوبل نے مرتے وقت ایک بہت بڑی رقم چھوڑی تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ اس رقم سے ہر سال پانچ انعام دیے جائیں۔ چنانچہ ان ہی کی وصیت پر ہر سال دو انعام ساری دنیا کے سب سے بڑے سائنسدانوں کو دیے جاتے ہیں۔ تیسرا انعام بہترین شاعر یا مضمون لکھنے والے کو، چوتھا سب سے قابل ڈاکٹر کو اور پانچواں انعام دنیا میں امن قائم کرنے والے کو دیا جاتا ہے اور ہر انعام میں ایک سونے کا میڈل، ایک سرٹیفیکٹ اور $2\frac{1}{2}$ لاکھ روپے دیے جاتے ہیں۔ یہ انعام ہر سال 10 دسمبر کو سویڈن کے بادشاہ تقسیم کرتے ہیں کیونکہ اسی تاریخ کو الفریڈ نوبل پیدا ہوئے تھے۔

ٹیگور وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھیں یہ نوبل پرائز ملا۔ اس سب سے بڑے انعام کے ملنے کے بعد سے تو ساری دنیا ٹیگور کو جاننے لگی اور دنیا کے ہر کونے سے انھیں

مبارکباد کے خط آنے لگے۔

پہلی بار کسی ہندوستانی شاعر کو یہ انعام ملنے پر سارے ہندوستان میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ٹیگور بھی اس بات سے خوش تھے کہ نوبل پرائز میں ملنے والی ڈھائی لاکھ کی رقم سے شانتی نکیتن کے اسکول کو بڑی مدد ملے گی۔

نوبل پرائز ملنے کے بعد سے ہندوستان میں ایسے لوگ بھی ٹیگور کی تعریف کرنے لگے جو انعام ملنے سے پہلے کبھی ان کی نظمیں پڑھنا تک پسند نہ کرتے تھے۔ ان تعریفوں سے ٹیگور کو خوشی کے بجائے دکھ ہوا۔ وہ ایک خوددار آدمی تھے اور ایسی جھوٹی تعریف کے بھوکے نہ تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ صرف اس لیے ان کی تعریف کررہے ہیں کہ گیتا نجلی کو یورپ کے لوگوں نے پسند کیا ہے۔

ٹیگور کو نوبل پرائز ملتے ہی سارے ہندوستان میں ان کے پہلے سے بھی زیادہ عزت کی جانے لگی۔ چنانچہ دسمبر 1913 میں کلکتہ یونیورسٹی نے ان کو 'ڈاکٹر آف لٹریچر' کی ڈگری دی۔ اسی طرح 1915 میں انگریزی حکومت نے 'سر' کا خطاب دیا۔ سر کا خطاب صرف ایسے لوگوں کو دیتی تھی جو ان کی نظر میں بہت ہی قابل ہوتے تھے۔ اس خطاب کے ملنے کے بعد سے وہ 'سر رابندرناتھ ٹیگور' کہلانے لگے۔

'گیتا نجلی' نے ٹیگور کو ساری دنیا میں مشہور کردیا اور اس کے بعد سے لوگ ان کی نظموں کو اور زیادہ شوق سے پڑھنے لگے، ہندوستان کی ساری زبانوں کے ساتھ ساتھ دنیا کی اور دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہونے لگا۔

گیتا نجلی لکھتے وقت ٹیگور کو کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ یہ کتاب اتنی زیادہ مشہور ہوگی، چنانچہ گیتا نجلی کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''میں نے جس وقت یہ نظمیں لکھیں تو ان کو چھپوانے کا کوئی خیال نہ تھا۔ یہ تو صرف اپنی بیوی اور بچوں کی موت کے غم کو بھلانے کے لیے لکھی گئی تھیں، لیکن بعد میں سوچا کہ ان نظموں کے پڑھنے سے شاید مجھ جیسے دوسرے دکھی لوگ بھی کچھ دیر کے لیے اپنا غم بھلا سکیں اس لیے اس کتاب کو پہلے بنگالی زبان میں چھپوایا۔''

ٹیگور نے خود ہی گیتا نجلی کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ کی کتاب سب سے پہلے لندن میں چھپی یہ اتنی مشہور ہوئی کہ کچھ ہی دنوں میں وہ ہزاروں کی تعداد میں بک گئی۔

گیتا نجلی کے بارے میں ٹیگور کے ایک انگریز دوست ایٹس نے جو خود بھی انگریزی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے، لکھا ہے کہ:

''میں کئی دنوں تک ٹیگور کی نظموں کے انگریزی ترجمے کو اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا رہا اور ریل گاڑیوں، بسوں اور ہوٹلوں میں پڑھا کرتا، بعض وقت تو مجھے یہ کتاب صرف اس لیے بند کردینی پڑتی کہ کہیں دوسرے لوگ یہ خیال نہ کریں کہ میں اس کتاب کا دیوانہ ہوگیا ہوں۔''

گیتا نجلی کی وجہ سے ٹیگور کی شہرت جب باہر کے ملکوں میں ہوئی، تب ہندوستان والوں کو معلوم ہوا کہ وہ کتنے بڑے شاعر ہیں۔

■

ماخذ: ہمارے ٹیگور، **مصنف:** صفدر حسین، **تیسری طباعت:** 2011، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

شیدا بگھونوی

بادل

آئے بادل جائے بادل
نیل گگن پہ چھائے بادل
رتھ پہ ہوا کے کرے سفر وہ
دور سے چل کر آئے بادل
کھیتوں میں تم دیکھو جاکر
امرت رس برسائے بادل
گورے اور کالے رنگوں میں
سب کے من کو بھائے بادل
کیسا ہندو کیسا مسلم
سب کو سکھ پہنچائے بادل
کبھی کبھی غصے میں آکر
بن برسے اڑ جائے بادل

■

Shaida Baghaunvi
Post: Shahpur Baghoni
Via: Vaini, Samastipur - 848131 (Bihar)
shaidabaghaunvi@gmail.com

شمیم انجم وارثی

برسات کا موسم

آئی رُت برسات کی آئی
باغوں میں ہریالی چھائی
کالے بادل گھر کر آئے
جھم جھم جھم پانی برسائے
امی میرا چھاتا لانا
لازم ہے اسکول بھی جانا
ورنہ مجھے کل ڈانٹ پڑے گی
ممکن ہے کہ مار پڑے گی
ٹیچر کو ہے سبق سنانا
ہوم ورک ہے انھیں دکھانا
پڑھ لکھ کر بدوان بنوں گا
میں بھارت کی شان بنوں گا
اپنا بھی اک مکتب ہوگا
جب رب راضی مجھ سے ہوگا
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
سب اک ساتھ پڑھیں گے بھائی
ذات پات کا بھید نہ ہوگا
کسی کو کوئی کھید نہ ہوگا

■

Shamim Anjum Warsi
237/2, Arabindo Pally
P.O: Garulia
Distt. 24 Pgs (North) (West Bengal)
shamimanjumw@gmail.com

نظم

پانی برسا

فہیم احمد

گھوڑوں جیسے دوڑے بادل
پانی برسا جھم جھم جھم

ٹپ ٹپ ایسے برسے
جسے موتی امبر میں سے
نظر بچا کر امی جی سے
نکل پڑے ہیں ہم تو گھر سے

کھیلیں چھپ چھپ پانی میں ہم
اچھلیں کودیں دھم دھم دھم
پانی برسا جھم جھم جھم

ندیاں نالے گیت سنائیں
بکری بھینسیں گانا گائیں
آؤ پانی میں کاغذ کی
ناؤ مزے سے ہم تیرائیں

دھرتی جھومے بادل بھیا
ڈھول بجائیں ڈھم ڈھم ڈھم
پانی برسا جھم جھم جھم

جب پانی کی پائی ٹھنڈک
نکلے جھنڈ میں سارے مینڈک
تان سین کے نانا بن کر
راگ الاپیں ٹرٹر ٹرٹر

دے کے بھیگی بلی سے، جب
بجلی چمکی چم چم چم
پانی برسا جھم جھم جھم

■

Dr. Faheem Ahmad
Assistant Prof., Dept of Hindi
Mahatma Gandhi Memorial (P.G) College
Chaudhary Sarai, Near Police Chowki
Sambhal - 244302 (UP)
Mob.: 8896340824
drfaheem807@gmail.com

نظم

کلیم نوری فیروزآبادی

بارش لے کر آیا بادل

دھرتی کو جب دیکھا بیکل
بارش لے کر آیا بادل

مور نے اپنے پر پھیلائے
کوئل میٹھے گیت سنائے
چڑیا بھی پر تول رہی ہے
خوش ہو کر یوں بول رہی ہے
آج خوشی سے دل ہے پاگل
بارش لے کر آیا بادل

بوند گری پتوں پر جس دم
ایک انوکھی نکلی سرگم
رقص کر اٹھا ذرہ ذرہ
اور کھل اٹھا چہرہ چہرہ
سارے جنگل میں ہے ہلچل
بارش لے کر آیا بادل

ہر سو سبزے اُگے ہوئے ہیں
مرجھائے گل کھلے ہوئے ہیں
قدرت کا کیا خوب ہے جادو
ہر ہر جانب بکھری خوشبو
ہے سرسبز زمیں کا آنچل
بارش لے کر آیا بادل

ندّی اور تالاب بھرے ہیں
نالے بھی لبریز ہوئے ہیں
ڈوب گئی ہیں سڑکیں بھی سب
کیسے باہر نکلیں ہم اب
سارا شہر ہوا ہے جل تھل
بارش لے کر آیا بادل

حلوا پوری چائے سموسے
کھیر کچوری گرم پکوڑے
دادی نے پکوان بنائے
سب نے مل جل کر ہے کھائے
کتنا لطف بھرا ہے یہ پل
بارش لے کر آیا بادل

روز نہ بارش میں تم بھیگو
بات پتے کی ہے یہ بچّو
بارش میں جو بھیگے زیادہ
اس کو ہو جائے گا نزلہ
ذہن میں رکھّو بات یہ ہر پل
بارش لے کر آیا بادل

■

Abdul Kaleem
11, Makka Colony, Ramgarh
Firozabad - 283203 (UP)
Mob.:9149114721, kaleemnoorie42@gmail.com

کتنا خاص ہے اپنا آم

شاھد اقبال

آؤ بچو! کھائیں آم
پہلے لے کر رب کا نام
آم پھلوں کا راجا ہے
سب کا پیارا کھاجا ہے
سبز، گلابی، پیلی، لال
رنگ برنگی اس کی کھال
بازاروں میں دھوم مچی
آم کی محفل خوب سجی
چونسہ اور دسہری لو
ہیم کا ساگر تم بھی لو
ہاپس، لنگڑا، بادامی
مالدہ، نیلم، سندوری
فضلی، گولا، بمبیّا
حسن آرا اور لال پری
آم کے لامحدود اقسام
یاد کرو گے کتنے نام
کچّے آم سے میرے یار
بنتی چٹنی اور اچار
آم کا شربت لذت دار
جب چاہو کر لو تیار
بوڑھے چوس کے کھاتے ہیں
بچے جوس بناتے ہیں

سب سے انوکھی اس کی ادا
کھائیں اس کو شاہ و گدا
اردو شاعر مرزا غالب
آم کے رہتے وہ بھی طالب
ڈھیروں آم منگاتے تھے
خوب مزے سے کھاتے تھے
دلّی میں وہ رہتے تھے
سب سے اکثر کہتے تھے
آم نہیں جو کھاتا ہے
وہ تو گدھا کہلاتا ہے
آم کی عظمت اتنی ہے
دیس کا پھل یہ قومی ہے
امریکہ سے ہندستان
سارے ملکوں کی یہ شان
یوں تو سستا اس کا دام
پھر بھی خاص بڑا ہے آم
سب تعریفیں اس رب کی
جس نے ہمیں یہ نعمت دی

■

Dr. Shahid Iqbal
P-258, Rameshwar Pur Road, 2nd Floor
Garden Reach
Kolkata - 700024 (West Bengal)
Mob.: 9674010530

شمس النسا کرن

چنچل بچے

چنچل نٹ کھٹ پیارے پیارے
ہوتے ہیں یہ بچے نیارے
اُن کے سندر چہرے دیکھو
جھلمل چمکیں جیسے تارے
جان چھڑکتی ہیں سب مائیں
چاند اور سورج ان پر وارے
مٹھو جیسا بولتے ہیں یہ
کانوں میں رَس گھولتے ہیں یہ
ہر دم مستی اور شرارت
کھل کھل ہنستے کھیلتے ہیں یہ
ہر کوئی ان سے پیار کرے ہے
گھر میں سب کے ہیں یہ دلارے
اچھی باتیں ان کو بتاؤ
علم و ہنر بھی ان کو سکھاؤ
فتنوں والے دور میں اب تم
سیدھا رستہ انھیں کو دکھاؤ
ان کا اجالا ہر سو پھیلے
سورج بن کر چمکیں سارے
پیاری کلیاں کھلتے پھول
ان سے مہکے یہ اسکول
آؤ کرن ان کو سکھلا دیں
اچھے اچھے پیارے اصول
جگ میں اچھا نام کمائیں
میرے دیش کے بچے سارے

■

Shamsunnisa Kiran
3-10-92/G2
Mukkadipet
Hindupur - 515201 (AP)
Mob.: 8500494611

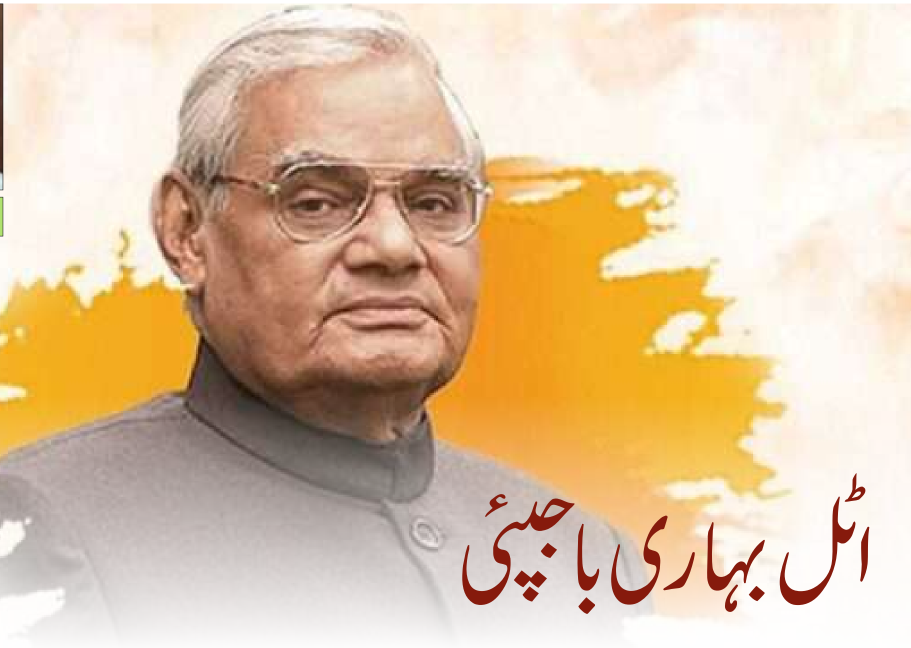

نظم

اٹل بہاری باجپئی

حبیب سیفی

اٹل انساں مثالی تھے تمھیں معلوم ہے بچو
اٹل جی حق کے ساتھی تھے تمھیں معلوم ہے بچو

عظیم انساں حقیقی تھے گوارہ ظلم ہی کب تھا
اٹل مظلوم حامی تھے تمھیں معلوم ہے بچو

صعوبت جیل میں جھیلی سہے تھے ظلم گوروں کے
اٹل ملکی سپاہی تھے تمھیں معلوم ہے بچو

نہیں جو متفق ہوتے، غلط ان کو نہیں کہتے
بنالیتے وہ دوری تھے تمھیں معلوم ہے بچو

ہے ان کا شعری مجموعہ وہ عمدہ ایک شاعر تھے
طبیعت میں گلابی تھے تمھیں معلوم ہے بچو

کنارا اس سے کرلیتے، نہ جس سے ذہن مل پاتا
جو پاتے کچھ خرابی تھے تمھیں معلوم ہے بچو

دیا نند کے اصولوں سے نہیں تھا اختلاف ان کو
رہِ حق کے وہ راہی تھے تمھیں معلوم ہے بچو

نہیں جو دیش کے ہت میں، کہاں وہ کام کرتے تھے
نبھاتے ذمے داری تھے تمھیں معلوم ہے بچو

سبق ان کی سیاست سے رواداری کا سیکھو سب
بقائے امن ساجھی تھے تمھیں معلوم ہے بچو

■

Habeeb Saifi
Hauzrani, Malviya Nagar
New Delhi - 110017
Mob.: 7838038973
habeebsaifi@gmail.com

بچوں کی انوکھی دنیا

پرویز شہریار

تیرہ سال کی عمر میں ہی کاشف کی کتاب کی رسمِ اجرا ہورہی تھی۔

اسکول کی جلسہ گاہ میں آج کی چھل پہل دیکھتے ہی بنتی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی کا ماحول تھا۔ ہر کوئی خوش نظر آرہا تھا۔

بات ہی کچھ ایسی تھی۔ اس عمر میں جب بچے فیصلہ نہیں کر پاتے ہیں کہ انھیں بڑے ہوکر کیا بننا ہے۔ کاشف نے پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ اسے بڑے ہوکر مصنف بننا ہے۔

دراصل، کتابوں سے اسے بہت پیار تھا۔ کتابیں پڑھنے کا اسے شروع سے ہی بڑا شوق تھا۔

وہ عام بچوں کی طرح کتابیں نہیں پڑھتا۔ بلکہ وہ سب سے پہلے کتاب کا سرورق دیکھتا تھا۔ جب اسے سرورق معنی خیز معلوم ہوتا تو کاشف کے اندر اس کتاب کو پڑھنے کا تجسس خود بخود پیدا ہوجاتا تھا۔

وہ کتاب کے ابتدائی صفحات پر پہلے کتاب کے مصنف کا نام دیکھتا۔ اگر مصنّف کوئی مشہور و معروف شخصیت ہوتی تو وہ اطمینان سے اس کتاب کا مطالعہ شروع کردیتا۔ لیکن اگر مصنّف کوئی غیر معروف شخص ہوتا تو وہ سب سے پہلے مصنف کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ اس کے والد نے اسے بتایا تھا:

”کتاب انسان کا سب سے اچھا ساتھی اور دوست ہوتا ہے۔ انسان جب کبھی تنہا ہو تو کتاب دوست بن کر اس کی تنہائی کو دور کرتی ہے اور اسے دنیا جہان کی سیر کراتی ہے۔ اس لیے کتاب کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔“

کاشف کو آج اپنے والد کے کہے ہوئے ایک ایک جملے یاد آرہے تھے:

”وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اچھی کتاب انسان کو ایک قابل انسان بنادیتی ہے، جس کی سماج میں بڑی آؤ بھگت

ہوتی ہے۔

لیکن ایک بری کتاب انسان کو گمراہ بھی کر سکتی ہے اور پھر سماج میں اس شخص کو اپنی بری عادتوں کی وجہ سے شرمندہ بھی ہونا پڑ سکتا ہے۔"

مہمان خصوصی کے آنے میں ابھی دیر تھی اور اسکول کے پرنسپل گوپال پردھان جی بہت بے قراری سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔

اس وقت تک کئی مہمان مقررین اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ان میں سے ایک اس کے استاد محسن خان صاحب تھے۔ان کے علاوہ، چند ایک مقامی حضرات بھی موجود تھے۔

شہر کے ممتاز ادیب اور متعدد کتابوں کے مصنف علامہ سلمان حیدر صاحب آج کی تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ان کے آتے ہی اسٹیج پر موجود سبھی لوگوں نے کھڑے ہو کر مہمانِ خصوصی کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔

سامعین میں محلے کے بڑے بزرگوں کے علاوہ اسکول کے سبھی طلبا اور طالبات بھی شامل تھے۔انھوں نے بھی ان کی تعظیم میں اپنی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر ادب کے ساتھ مہمانِ خصوصی کا استقبال کیا۔

اسٹیج پر بیٹھے ہوئے سبھی مہمانوں کو خوش لباس طالبات کے ذریعے گلدستے پیش کیے گئے۔

تقریب کے باضابطہ آغاز کے لیے اسکول کے ہر دل عزیز استاد محسن خان نے مائک اپنے ہاتھوں میں سنبھالا اور آج کے ہیرو اور محفل کی جان کاشف کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ننھا شہزادہ بلا کا ذہین طالب علم ہے، یہ ایک بار جو سبق پڑھ لیتا ہے، اسے وہ یاد ہو جاتا ہے۔کاشف پڑھائی کا اتنا شوقین ہے کہ اسکول کبھی ناغہ نہیں کرتا اور اس کی سو فی صدی حاضری کی وجہ سے اسے انعام بھی مل چکا ہے۔

مختصر تعارف کے بعد کاشف کو اسٹیج پر بلایا گیا تو کاشف نے اپنے دھڑکتے دل کے ساتھ مہمانوں اور سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے، اپنی کتاب کے بارے میں بتانا شروع کیا:

"میری کتاب کا عنوان ہے، 'بچوں کی انوکھی دُنیا'۔ اس میں میری سات کہانیاں شامل ہیں۔"

اپنی تقریر کے دوران کاشف نے بتایا کہ اس نے کہانیاں چھ سال کی عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ان کہانیوں میں کاشف نے بتانے کی کوشش کی تھی کہ بڑوں کی دُنیا بہت عجیب و غریب ہوتی ہے۔ان کے روّیے بہت کٹھن اور آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والے ہوتے ہیں۔جس کی وجہ سے اکثر بچے انھیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، کچھ بچے ان سے گھبراتے اور ڈرتے بھی ہیں۔

کاشف نے اپنی تقریر کے دوران مہمانوں کی طرف دیکھتے ہوئے مزید کہا:

لیکن بچوں کی دُنیا بہت انوکھی اور معصوم ہوتی ہے، بچوں کی چھوٹی سی دُنیا میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوتی ہیں۔انھیں کسی بات کی فکر نہیں ہوتی۔وہ بڑوں کی طرح کسی تناؤ کا شکار نہیں ہوتے۔انھیں جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے، والدین انھیں دستیاب کرا دیتے ہیں۔بچوں کو کھیلنا کودنا بہت پسند ہوتا ہے۔

کاشف نے اپنی کتاب میں شامل ایک کہانی، 'بہادری کا انعام' کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے کہا کہ" اس کہانی کا ہیرو اعیان ایک بہادر بچہ تھا۔اس کی

عقل مندی اور بہادری کی وجہ سے پولس نے چوروں کو پکڑنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کہانی پر اسے اسکول کے افسانہ کلب کی طرف سے اوّل انعام بھی مل چکا ہے۔

جلسے میں موجود بچوں میں سے کسی ایک طالب علم نے کاشف سے جب یہ سوال کیا کہ آپ کو کہانی لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا۔ تب اس نے جو بات بتائی، اُسے سن کر سب حیران رہ گئے۔

''ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔'' میں اپنی جماعت کا مانیٹر تھا۔ ایک دن جب میں دیر سے اسکول آنے والے طلبا کی مدد سے اسکول کے احاطے کی صفائی کرا رہا تھا۔ تب مجھے کسی کتاب کا ایک ورق زمین پر پڑا ہوا ملا۔ اس ورق کو میں نے اُٹھا لیا اور اس پر پڑی دھول اور گرد صاف کر کے جب میں نے غور سے دیکھا تو وہ کسی کہانی کا آخری صفحہ تھا، جس پر کہانی کار کا نام لکھا ہوا تھا۔ منشی پریم چند!''

کاشف نے جب اپنے استاد سے منشی پریم چند کے بارے میں دریافت کیا، تو اسے پتہ چلا کہ پریم چند بہت بڑے کہانی کار تھے۔ انھوں نے بڑی تعداد میں ایسی اچھی اچھی کہانیاں لکھیں ہیں کہ انھیں کہانی سمراٹ یعنی کہانیوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اور وہ صفحہ کوئی معمولی صفحہ نہیں تھا بلکہ پریم چند کی مشہور کہانی 'عیدگاہ' کا آخری صفحہ تھا۔

کاشف نے گھر آ کر اپنے والد سے سارا واقعہ بیان کیا اور اس کہانی کو مکمل طور سے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔

کاشف کے والد ادب نواز انسان تھے۔ انھوں نے فوراً اپنے لاڈلے بیٹے کی فرمائش پوری کر دی۔

اب تو کاشف تھا اور پریم چند کی کہانیاں۔ ایک ہفتے میں اس نے کئی کہانیاں اپنے والد کی مدد سے پڑھ ڈالیں۔

وہ دن ہے اور آج کا دن!

کاشف ہر روز رات میں سونے سے پہلے کوئی نہ کوئی کہانی ضرور پڑھتا ہے۔

کاشف نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے اپنے ننھے منھے دوستوں اور بڑے بزرگ سبھی سامعین کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی تقریر کے دوران بتایا کہ:

''شاید اُسی دن مجھے کہانی لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، جب میرے استاد محسن سر نے بتایا تھا کہ ہر کہانی کا کوئی نہ کوئی مصنف ضرور ہوتا ہے۔ تم بھی اگر کہانی لکھو گے تو تم بھی اس کہانی کے مصنّف کہلاؤ گے۔''

کاشف کی تقریر جیسے ہی ختم ہوئی۔ سبھی مہمان مقررین اسٹیج پر کھڑے ہو گئے اور کاشف کی کتاب 'بچوں کی انوکھی دُنیا' کے رنگ برنگے پیکٹ سبھی کے ہاتھوں میں چمک رہے تھے۔ سب نے ایک ساتھ پیکٹ کا رِبن کھولا اور اپنے اپنے ہاتھوں میں کتاب لے کر فوٹو گرافروں کی طرف اس کا رخ کر دیا۔

سامعین نے تالیوں کی گونج کے ساتھ کتاب کی رسمِ اجرا پر اپنی خوشیوں کا اظہار کیا۔ کاشف کے چہرے پر اس وقت فاتحانہ مسکراہٹ دیکھتے ہی بنتی تھی۔

اس کا سر فخر سے اونچا ہو گیا، کیونکہ آج وہ بھی اپنی کتاب کا مصنّف بن چکا تھا۔

■

Dr. Perwaiz Shaharyar
Flat No.43-C, Pocket-A, DDA Flats
Sukhdev Vihar, New delhi - 110025
Mob.: 9910782964

رنگ برنگی چھتری اور پتنگ

طٰہٰ نسیم

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ فیشن نے بھی خوب ترقی کی ہے۔ انسان اور جانور تو کیا اب عام استعمال کی چیزیں اور کھیل کھلونے تک فیشن ایبل ہو گئے ہیں۔ پہلے پتنگیں لال پیلی ہری نیلی کالی سفید بنتی تھیں۔ اس کے بعد چاند تارہ اور ترنگا لباس پہن کر ہوا میں اٹھلاتی، اتراتی اڑتی پھرتی۔ اس کے بعد چینی پتنگیں آئیں اتنی عجیب و غریب کہ عقل حیران رہ جائے۔ کوئی چیل جیسی تو کوئی آدمی کی شکل کی، کوئی ہوائی جہاز بن کر آئی تو کسی نے کھلے ہوئے پھول کا روپ لیا۔ اب تو چمکنے والی پتنگیں بھی رات کو تاروں کی طرح ٹمٹماتی نظر آ رہی ہیں۔ پندرہ اگست اور رکشا بندھن پر تو آسمان میں خوبصورت رنگوں میں کاغذ کی چیلوں کی دنیا بس جاتی ہے اور نیلا آسمان گلزار ہو جاتا ہے۔

اب پندرہ اگست کی بات چلی ہے تو یہ مہینہ ہندوستان میں مانسون کا ہوتا ہے۔ رک رک کر بارش ہوتی ہے اس موسم میں خوبصورت اور نئے ڈیزائن کی چھتریاں دکان پر لٹکی نظر آتی ہیں۔ پہلے ان کا رنگ بھی ایک ہی ہوتا تھا سبھی کالے رنگ کی بنتی تھیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے بھی فیشن کو اپنا لیا۔ اب رنگ برنگی پھولوں، کارٹونوں اور نعروں سے سجی چھتریاں بازاروں میں ملتی ہیں۔ پہلے چھتریاں گول ہوتی تھیں لیکن اب چوکور اور تکونی چھتریاں بھی نظر آتی ہیں۔ پہلے آپ کو چھڑی کی طرح چھتری پکڑ کر چلنی پڑتی تھی، اب تو چھتری موڑو اور مٹھی میں تھام یا پرس اور بیگ میں رکھ لو۔ بچوں کو رنگ برنگی نئے ڈیزائن کی چھتریاں بہت پسند ہیں۔

اس بار یہی تو ہوا، فائز کے پاپا نے انھیں ننھی سی خوبصورت چھتری دلوائی اور پندرہ اگست سے دو دن پہلے بازار سے رنگین پنی کی گلابی پتنگ اور ڈور بھری چرخی لائے تاکہ فائز پندرہ اگست کو چھت پر پتنگ اڑا رہے ہوں اور بارش ہو جائے تو وہ اپنی رنگین چھتری کھول لیں۔ لیکن اس بار پندرہ اگست کو اتنی تیز بارش ہوئی کہ چاروں طرف جل تھل ہو گیا۔ بے چاری پتنگ اڑنے کے لیے بے قرار تھی اور کھونٹی پر لٹکے لٹکے تھک گئی تھی۔ اس دن فائز میاں اپنی رنگین چھتری تانے صحن میں بھرے برسات کے پانی میں کاغذ کی ناؤ چلا رہے تھے اور خوش تھے۔ ان کی ناؤ پانی میں ہچکولے کھاتی تو وہ اپنی چھتری اس پر تانے تانے اس کے ساتھ ساتھ چلتے اور خوشی سے کلکاریاں مارتے۔ کھونٹی پر لٹکی پتنگ یہ نظارہ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی کہ میں تو یہاں کھونٹی سے بکری کی طرح بندھی ہوئی ہوں اور چھتری کے مزے ہیں خوب بارش میں نہا رہی ہے اور فائز میاں کو گیلا ہونے سے بچا رہی ہے۔

دوپہر کو امی نے گرما گرم پکوڑے اور نمکین بنائے تھے۔ گھر کے سبھی بچے کھیل کود چھوڑ کر دستر خوان پر آ گئے۔

کہانی

فائز میاں نے چھتری بند کر کے ایک کونے میں رکھ دی۔ چھتری سے اب بھی پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کی خوشی دیکھ کر پتنگ اور جل بھن گئی۔ اس نے چھتری کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''بی چھتری بڑی اترا رہی ہو'' تھوڑی دیر بچے کو بارش سے کیا بچا لیا اپنے آپ کو طرم خاں سمجھنے لگی۔''

چھتری نے نظریں اٹھا کر پتنگ کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''پتنگ بہن ایسا مت کہو! بھلا میں کیوں اترانے لگی۔ بھئی میرا کام تو لوگوں کو گیلا ہونے سے بچانا ہے۔ وہ میں بخوبی انجام دے رہی ہوں۔ اب برسات کا موسم ہے بچے گیلے ہو جاتے ہیں اور انھیں نزلہ زکام اور کھانسی جیسی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہوتی ہوں تو وہ گیلے ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ میرا کام تو خدمت خلق ہے اور مجھے یہ کام کر کے بڑی راحت محسوس ہوتی ہے۔''

پتنگ بولی! اس میں غرور کرنے کی کیا بات ہے، میں بھی تو آسمان کی اونچائیوں میں اڑ کر بچوں کو خوشی دیتی ہوں۔ وہ مجھے جتنا اوپر لے جاتے ہیں اتنے ہی خوش ہوتے ہیں۔ جب دو پتنگوں کے پینچ لڑ رہے ہوتے ہیں تو بچوں کا جوش قابل دید ہوتا ہے۔ اصل خوشی تو میں انھیں دیتی ہوں۔ بچے بڑے سبھی میرے دیوانے ہیں۔ بارہ مہینے آسمان کی سیر کرتی ہوں، اونچائی سے دنیا کے نظارے کرتی ہوں، تم تو صرف تین چار مہینے کوٹھری سے باہر آتی ہو اور اس کے بعد واپس کسی کونے میں دھکیل دی جاتی ہو۔ تم اچھی یا میں اچھی۔ ذرا بتاؤ تو؟

چھتری نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''پتنگ بی ہوش کے ناخن لو۔ تم جس قسم کی خوشی بچوں کو دیتی ہو اگر بچے اس کے عادی ہو جائیں تو وہ پڑھائی پر کم اور تم پر زیادہ دھیان دیں گے، اب میرا منہ کھلوا ہی دیا ہے تو سنو۔ کتنے بچے صرف تمھاری وجہ سے چھتوں اور دیواروں سے گر کر یا تو دنیا سے چلے گئے یا زندگی بھر کے لیے اپاہج۔ پتنگ بازی کے مقابلوں میں اکثر تو تو میں میں سے بات بڑھ کر لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے، لوگ ایک دوسرے پر پتھراؤ کرتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں۔ پتنگ لوٹنے کے چکر میں کتنے ہی بچے سڑکوں پر حادثات کے شکار ہوتے ہیں۔

تمھیں خریدنے کے چکر میں یا تو اپنا جیب خرچ برباد کرتے ہیں یا گھر میں چوری۔ بھلا ایسی خوشی کس کام کی جو اتنی برائیوں کا سبب بنے۔

میں بے شک تمھاری طرح آسمان کی اونچائیاں نہیں ناپتی نہ ہی میلوں کے سفر کرتی ہوں لیکن میں لوگوں کو بھیگنے سے بچاتی ہوں۔ وہ مجھے بڑی حفاظت سے رکھتے ہیں جب بھی بارش پڑے یا تیز دھوپ ہو تو وہ میرے نیچے آ کر سکون حاصل کرتے ہیں۔ مجھے ایک بار خریدا جائے تو سالوں اپنے مالک کی خدمت کرتی ہوں۔ تم تو اڑانے کے تھوڑی دیر بعد کٹ کر کہیں اور چلی جاتی ہو یا کسی درخت اور ٹی وی اینٹینا میں پھنس کر پھٹ جاتی ہو۔ پھر کس بات پر غرور کرتی ہو۔

چھتری کا جواب سن کر پتنگ خاموش ہو گئی۔ پورے دن بارش ہوتی رہی اور فائز میاں نے پتنگ کی جانب دیکھا تک نہیں۔

■

Taha Naseem
2793, Pahari Bhojla, Turkman Gate
Delhi - 110006
dilliad6@gmail.com

شناخت

صابر پرواز

ایک دیہات تھا۔ دیہات کے باہر جنوب کی جانب ایک کلومیٹر کے فاصلے پر عیدگاہ تھی۔ عیدگاہ کے اطراف ایک وسیع میدان تھا۔ میدان کے شمال مشرق کے درمیان دائرہ نما ایک لمبا چوڑا اور گہرا گڑھا تھا جو بارش کے پانی سے بھر کر تالاب کا روپ اختیار کر لیتا تھا جسے بستی والوں نے 'باغ ڈوب' کا نام دے رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کسی زمانے میں ست پڑا جنگل کے بھٹکے ہوئے شیر اسی تالاب کا پانی پیتے تھے۔

تالاب کے آس پاس ببول کے کئی پیڑ تھے جن کے سائے میں دوپہر کے وقت چرواہے بھینسوں کے جھنڈ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ کچھ بھینسیں وہیں سائے میں آرام کرتیں، کچھ کنارے کنارے پانی میں بیٹھ جاتیں اور کچھ بیچ تالاب میں تیرتی ہوئی نظر آتیں۔

تالاب پر بھینسوں کا بول بالا تھا لیکن وہاں بادشاہت تھی ایک سنہرے رنگ کے سانڈ بیل کی، جس کے نمایاں قد اور بھرپور صحت نے اس کے دبدبے میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے کمانی دار سینگ نیچے سے گول اور اوپر کی جانب نیزے کی طرح نوکدار تھے جو ہتھیار بند سپاہیوں کی طرح یہ اعلان کرتے ہوئے محسوس ہوئے کہ راستے سے ہٹ جائے، بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں اور بھینس جو فطرتاً اڑیل ہوتی ہیں، راستے سے ہٹ جایا کرتی تھیں۔ اس کے چہرے مہرے کو ایک وقار حاصل تھا۔ گردن موٹی موٹی اور رعب دار تھی۔ گردن کے نیچے اس کی جلد شہد کے بڑے چھتے کی طرح ایسے لٹکی ہوئی تھی جیسے کسی نے جچے تلے انداز سے گلے میں ریشمی شال لپیٹ دی ہو۔ کاندھوں کے بیچ گوشت پوست کا ایک خوش نما گنبد تھا جو پیٹھ اور گردن کی طرف جھکا ہوا اور درمیان سے اٹھا ہوا تھا۔

تالاب کے کنارے ایک قد آور اور پھیلا ہوا برگد کا پیڑ تھا جس کے سائے میں وہ سانڈ بیل اپنی سلطنت قائم

کیے ہوئے تھا اور اس کے آس پاس دیگر جانور تو کیا پرندے بھی بسیرا کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

اس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ کسی نے اسے چارا چرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ انسانوں کی طرح پکا ہوا کھانا پسند کرتا تھا۔ اسے جب بھوک لگتی بستی کی طرف نکل جاتا اور گھر گھر آواز لگاتا۔ بستی والے اسے دیکھتے ہی بچا کھچا کھانا اس کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ وہ بستی والوں سے مانوس اور بستی والے اس پر مہربان تھے۔ جب اس کا پیٹ بھر جاتا واپس برگد کی چھاؤں میں ایسے بیٹھ جاتا جیسے تخت شاہی پر براجمان ہو۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

ایک روز جب بستی سے لوٹا، تھوڑا پانی پیا اور بہت دیر تک تالاب میں اپنے عکس کو دیکھتا رہا۔ اسے اپنی کمانی دار سینگ بہت پسند تھی جس پر وہ ناز کرتا تھا۔ وہ کچھ دیر اور اپنے عکس سے لطف اندوز ہوتا لیکن دھوپ کے تیزی نے اسے وہاں سے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پیڑ کی چھاؤں میں آ کر بیٹھ گیا۔

گرمی کا موسم، دوپہر کا وقت___ کڑی دھوپ میں ہوا کی بہتی لہریں سراب کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ گرمی کی شدت نے اس کا سارا سکون چھین لیا تھا۔ اس نے اپنے پیر ایک طرف کیے اور وہیں لیٹ کر اونگھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گہری نیند میں ڈوب گیا۔

کئی گھنٹے کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی اس نے شدید پیاس محسوس کی۔ وہ تیز قدموں سے تالاب کی طرف بڑھا اور جیسے ہی پانی پینا چاہا اس کی نظر اپنے عکس پر پڑی تو وہ ٹھٹھک گیا۔ یہ کیا! اس کے سر پر تو سینگ ہی نہیں ہے! اس نے بے چینی سے اپنا منہ پانی سے ہٹا لیا، اس کے ہونٹوں سے پانی کی بڑی بڑی بوندیں واپس پانی میں ملنے لگیں۔ وہ اپنی پیاس بھول چکا تھا۔ اسے اپنا سینگ بہت عزیز تھا۔ وہ جب بھی پانی پینے آتا اپنی صورت ضرور دیکھ لیا کرتا تھا۔ اب جو اس نے سر سے سینگ غائب دیکھا تو اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے بیک وقت بجلی کے کئی تار اس کے بدن میں پیوست کر دیے ہوں۔ وہ اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے کبھی اپنے عکس کو اور کبھی آسمان کو تکتا۔ وہ غش کھا کر وہیں بیٹھ گیا اور زیر لب بڑبڑانے لگا۔ میرا کیا ہوگا۔ بستی میں کون سا منہ لے کر جاؤں گا۔ لوگ مجھے گدھا کہہ کر میرا مذاق اڑائیں گے___ اے میرے خدا! یہ کیا ہو گیا۔ میں تو صدفی صد گدھا بن کر رہ گیا ہوں۔ نہیں، نہیں! میں بستی والوں کو اپنا چہرہ نہیں دکھاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا لیکن کہیں نہیں جاؤں گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا جو قطعی آخری تھا۔ اسی فیصلے کے دوران سورج ڈھلتا، نکلتا رہا۔ وقت گزرتا گیا___ مسلسل بھوک سے اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی رہی۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ اپنی پوری شدت سے برگد کے پیڑ اور تالاب کو ایسے گھور رہی تھی جیسے ایک ہی سانس میں پی جائے گی۔ گرمی کا دباؤ بڑھ جانے کی وجہ سے ہوا بے قابو ہو کر چکر دھاری ہو گئی تھی۔ بگولے کبھی اِدھر کبھی اُدھر ناچ رہے تھے۔ بدنصیب سانڈ بیل پہلے ہی بھوک کی شدت سے ڈھیر ہو چکا تھا۔ اب منہ زور گرم ہوا کی وجہ سے خود کو بکھرتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ بستی کے وہ مہربان لوگ جو اس کا خیال رکھتے تھے، ایک ایک کر کے نگاہوں میں گھومنے لگے___ ابھی وہ سوچ کی اس گیلی مٹی

سے گزر رہی رہا تھا کہ اسے دور سے کوئی آتا ہوا دکھائی دیا۔ آنے والا ایک گدھا تھا۔ وہ گدھا اس کے قریب آ کر رک گیا۔ بیل نے بڑی بیزاری سے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا کیونکہ خلافِ فطرت گدھے کے سر پر سینگ تھا!!

ہلنے کی طاقت نہ رکھنے والے بیل میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ اپنے پیروں پر تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ وہ بے تحاشہ گدھے پر برس پڑا: اے گدھے! یہ تونے کیا کیا مجھ سے دشمنی تھی تو مجھے جان سے مار دیتا، میرے سینگ چرا کر تونے مجھے زندہ دفن کردیا ہے، یہ سینگ ہی تو میری شناخت ہے۔ اس کے بغیر میں بیل کیسے ہوسکتا ہوں!''

گدھے نے بڑی دلچسپی سے بیل کی پتا سنی اور اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا: میں ہرے گھاس کی تلاش میں میلوں دور نکل گیا تھا، لوٹنے میں تاخیر ہوگئی ورنہ فوراً تیرے سینگ تجھے لوٹا دیتا۔ اے بیل! تجھے کیا خبر مجھ پر کیا بیتی۔ کیا کیا اذیتیں جھیلی ہیں میں نے۔ یہ تیرے سینگ تیرے لیے راحت ہوں گے میرے لیے عذاب ہیں۔ ان کی وجہ سے میری شناخت برباد ہوگئی۔ غیر تو غیر برادری والوں نے مجھ ایسے حقیقی گدھے کو بیل ہونے کا طعنہ دیا۔ یہ کہتے ہوئے گدھے نے وہ سینگ بیل کے منہ پر دے مارا اور فاتحانہ انداز میں پشت کی بائیں لات جھاڑ کر خرمستی میں دولتی مارتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا!

■

Sabir Parwaz
Anjuman School Road
Jam Mahollah: Bhusawal- 425201
Distt.: Jalgaon (Maharashtra)
Mob.: 9637580120
sabirparwaz120@gmail.com

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ...

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے IFSC: CNRB0019009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

Email.: magazines@ncpul.in , 011-26108159: فیکس 011-26109746: فون

دستخط

شیخ حسین

پنجرے والی نانی

جب اچانک بہت ساری چڑیوں کی چہچہاہٹ شارق کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ نیند سے بیدار ہو گیا۔

''ایں! ابھی ابھی تو اتنی ساری چڑیا چہچہا رہی تھیں۔ پھر یہ ایک دم خاموشی کیسی چھا گئی؟''

شارق نرم بستر پر نیند سے جاگنے کے بعد لیٹے لیٹے حیران ہو کر سوچنے لگا تھا کہ پھر چڑیوں کی چہچہاہٹ سے کمرہ گونج اٹھا۔

''ارے شارق میاں۔ جاگ گئے ہو تو ذرا دروازے پر دیکھو۔ شاید دودھ والا ہو گا۔ ڈور بیل بجا رہا ہے۔''

باورچی خانے سے شارق کی پھوپھو چیخ کر بولیں تو شارق نے لپک کر دروازہ کھولا۔ دودھ والا دودھ کے پیکٹ دہلیز پر رکھ کر جا رہا تھا۔ شارق کل ہی اپنے گاؤں سے اپنی پھوپھو کے گھر شہر آیا تھا۔ گاؤں سے اپنی پھوپھو کے گھر وہ اِس سے پہلے بھی آیا کرتا تھا، لیکن مہمان بن کر، ایک دو دن یا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یہاں گزار کر واپس گاؤں لوٹ جاتا۔ اِس بار وہ گاؤں سے شہر اپنی تعلیم جاری رکھنے کی غرض سے آیا تھا۔ کیونکہ گاؤں کے اسکول میں سات جماعتوں تک ہی انتظام تھا۔ شارق دودھ کے پیکٹ باورچی خانے میں لے کر پہنچا تو پھوپھو اُسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولیں:

''کیوں شارق میاں! رات آرام سے سوئے نا؟''

''جی پھوپھو جان۔'' جواب میں شارق بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

''پھوپھو! آپ کے دروازے کی گھنٹی نے مجھے اپنے گاؤں کی یاد دلا دی۔''

''کیا تمھارے گھر بھی اسی طرح کی کال بیل ہے؟''

پھوپھو نے ٹوتھ برش پر پیسٹ نکال کر شارق کی جانب بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''نہیں پھوپھو، گاؤں میں تو آج بھی گھر آیا مہمان کنڈی بجا کر ہی اپنے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔ پر آج بھی ہمارے گاؤں میں بہت ساری چڑیا اِسی طرح شور مچاتی ہیں جس طرح آپ کے دروازے پر لگی ڈوربیل کچھ دیر بج کر خاموش ہو جاتی ہے۔ ارے پھوپھو! اب آپ کہاں کھوگئیں؟'' شارق نے پھوپھو کو خیالوں میں کھوئے پا کر ہنس کر بولا۔

''میں بھی گاؤں کے پرسکون ماحول میں کھوگئی تھی۔ ہاں شارق میاں! کتنا مزہ آتا تھا۔ وہ ہرے بھرے درختوں کی قطاریں جس پر سینکڑوں پرندے اور کئی رنگ برنگی تتلیاں منڈلاتی تھیں۔ پر بھیا شہر میں تو درختوں کی پینٹنگ دیواروں پر ٹنگی ہوتی ہے اور چڑیوں کی آوازیں کال بیل کی صورت میں بجتی ہے۔'' کہ پھر بہت ساری چڑیوں کی آواز کال بیل میں بج اٹھی، جسے سن کر شارق دروازہ کھولنے کے لیے دوڑ پڑا۔ وہ کافی دیر تک دروازے پر کھڑا باتیں کیے جا رہا تھا۔

''شارق! کون ہے؟ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟'' پھوپھو نے دیوان خانے سے بیٹھے بیٹھے اپنی آواز و گردن اونچی کر کے پوچھا تو شارق دیوان خانے میں آ کر کہنے لگا: ''ایک بوڑھی عورت ہے۔''

''جس کے ہاتھ میں ایک پنجرہ ہوگا، بکھرے بال، میلی پھٹی سی ساڑی پہنے ہوگی۔'' شارق سے پہلے اُس کی پھوپھو نے کہہ دیا: ''اور کہہ رہی ہوگی کہ تمھارے پاس ہمارا طوطا اُڑ کر آیا ہے کیا؟''

''ہاں ہاں! پھوپھو ایسا ہی کہہ رہی تھی وہ۔ آپ کو کیسے معلوم؟'' شارق نے حیران ہو کر پوچھا۔

''سنو شارق! وہ پگلی ابھی بھی دروازے پر کھڑی ہوگی، وہ ایسے جانے والی نہیں، پہلے جلدی جاؤ اور اس سے کہو ہمارے پاس درخت نہیں ہے۔''

''پر پھوپھو! وہ کون ہے؟ اور تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ۔''

''شارق میاں! پہلے جلدی جا کر اس سے کہو، ورنہ وہ گھر میں گھس آئے گی۔''

شارق دوڑ کر دروازے پر پہنچا تو واقعی وہ اندر آ رہی تھی۔ جسے شارق نے روکتے ہوئے کہا: ''ارے نانی رُکیے، ہمارے پاس درخت نہیں ہے۔''

''درخت نہیں ہے؟ تمھارے پاس بھی درخت نہیں ہے؟'' وہ جانے کے لیے باہر کی جانب پلٹی اور گلی میں بڑبڑاتی ایک جانب چل دی۔

''شارق میاں! اب دروازہ بند کر کے اندر آ جاؤ۔ کیا اب اس کے ساتھ، اُس کھنڈر میں جانا ہے جہاں وہ رہتی ہے۔'' شارق کے پیچھے کھڑی اس کی پھوپھو نے ہنستے ہوئے کہا اور دیوان خانے میں آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ تو اُن کے پیچھے شارق آ کر بولا:

''کہیے نا پھوپھو، کون ہے وہ بوڑھی عورت؟''

شارق کے سوال پر پھوپھو نے مسکراتے ہوئے شارق سے ہی سوال کرتے ہوئے کہا:

''اچھا شارق میاں! یہ بتاؤ تم نے اُس بوڑھی کو کیا کہہ کر مخاطب کیا تھا؟''

شارق پھوپھو کے سوال پر کچھ دیر دماغ پر زور دینے کے بعد بولا: ''۔۔۔جی۔۔۔ میں نے اُسے نانی کہا تھا۔''

جسے سن کر پھوپھو بے تحاشا ہنس پڑی اور بولیں: ''آخر تم نے بھی اُسے نانی ہی کہا۔''

''کیوں؟ مجھے اسے نانی نہیں کہنا چاہیے تھا؟''
''نہیں نہیں شارق میاں! ایسی بات نہیں ہے۔تم کیا اِس محلے کا ہر مرد، ہر عورت، چھوٹے کیا بڑے کیا بلکہ اُس کے ہم عمر بزرگ بھی اُسے نانی ہی کہتے ہیں۔ پنجرے والی نانی۔'' شوخی سے کہتے کہتے پھوپھو سنجیدہ لہجے میں کہنے لگیں: ''پتہ نہیں میاں! یہ غریب بڑھیا کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ بس اپنے ہاتھ میں طوطے کا خالی پنجرہ لیے محلے کے ہر گھر میں روز یہ کہتے پھرتی ہے کہ ''ہمارا طوطا تمھارے پاس اُڑ کر آیا ہے کیا؟''
پنجرے والی نانی کے بارے میں پھوپھو جتنا جانتی تھی اتنا شارق کو بتا کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگئی تھیں، البتہ شارق رات کا کھانا کھانے کے بعد بھی بستر پر لیٹے لیٹے اسی بڑھیا کے تعلق سے سوچ جا رہا تھا۔
''نانی — او پنجرے والی نانی۔'' شارق نے محبت بھرے نرم لہجے میں پکارا۔تو اندر سے جواب آیا: ''مٹھو بیٹے پپی دے۔''
بڑی عجیب آواز تھی۔ یہ تو نانی کی آواز نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ آج صبح ہی اس نے نانی کی آواز سنی تھی۔ وہ اپنی جگہ کھڑا کھڑا سوچنے لگا پھر بولا:
''کون نانی ہے کیا؟''
''نہیں وہ سو رہی ہیں۔'' پھر اندر سے ہی عجیب سی آواز میں جواب آیا۔
''تم کون ہو؟'' شارق نے ڈر سے کانپتی آواز میں کہا۔
''— جی — میں راجہ ہوں۔''
''راجہ! کہاں کے راجہ ہو تم؟'' شارق نے تعجب سے کہا۔
''اجی میاں میرا نام راجہ ہے۔ میں تمھاری اِس پنجرے والی نانی کا طوطا ہوں۔''
''کیا تم نانی کو مل گئے؟'' شارق نے خوش ہو کر پوچھا۔
''نہیں میاں! ویسے تو میں کبھی کھویا ہی نہیں تھا، میں

ہمیشہ نانی کے ساتھ ہی رہتا ہوں لیکن اُن کی نظروں سے بچتا ہوں۔‘‘

’’ایں ! ایسا کیوں؟‘‘ شارق نے دروازے کی جانب منہ کیے سوال کیا:

’’کیونکہ وہ مجھے پھر سے پنجرے میں قید کرلے گی۔‘‘

’’کیوں راجہ۔نانی کیا ظالم ہے؟وہ تم پر ظلم کرتی ہے؟‘‘

’’نہیں نہیں میاں ! وہ تو مجھ سے بہت محبت کرتی تھی، میرا بڑا خیال رکھتی تھی، اب دیکھونا یہ ان کی محبت ہی ہے جو کئی سال پہلے ان کے پنجرے سے آزاد ہونے کے بعد بھی وہ مجھے تلاش کرتی پھر رہی ہیں۔‘‘ طوطا بھرائی آواز میں بولا۔

’’تو طوطے میاں،تم ظالم ہو، جو اتنی پیار محبت کرنے والی اپنی مالکن کو اِس طرح تڑپا رہے ہو۔‘‘

’’نہیں نہیں میاں۔ اللہ نہ کرے۔‘‘ طوطا تڑپ کر کہنے لگا: ’’اگر میں ظالم ہوتا یا مجھے اپنی مالکن سے محبت نہ ہوتی تو کب کا کہیں اڑ چکا ہوتا۔ ایسے ان کی دیکھ بھال نہیں کرتا۔‘‘

’’تم نانی کے سامنے کیوں نہیں آتے؟‘‘ شارق عمارت کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

’’نہیں میاں اگر میں نانی کے سامنے یا ان کے ہاتھ میں آ گیا تو وہ مجھے پھر سے قید کردے گی۔‘‘

’’تو طوطے میاں تمھیں اِس سے کیا؟ نانی تو تمھارا بہت خیال رکھتی ہے نا، وہ تمھیں کتنا چاہتی ہے۔‘‘

شارق کی باتیں سن کر طوطا قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا: ’’میاں! بے شک نانی مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے، میرا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے، لیکن بھیا قید، قید ہوتی ہے اور آزادی آزادی۔ یہ نانی کا پنجرہ تو لوہے کا ہے اگر وہ پنجرہ سونے کا بھی ہوتا تو میں قید ہونا نہیں چاہوں گا۔‘‘

’’سنو طوطے میاں‘ کیا تم میرے سامنے آ سکتے ہو؟ میں تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کیوں؟ پہلے کبھی طوطا نہیں دیکھا؟‘‘ طوطے نے اپنے لہجے میں تھوڑی سی سختی لاتے ہوئے کہا۔

’’ہاں طوطے میاں! میں نے طوطے تو بہت سارے دیکھے ہیں، باتیں کرنے والے طوطے بھی دیکھے ہیں لیکن وہ رٹی ہوئی باتیں کرتے ہیں لیکن آج تمھارے جیسے انسانوں کی طرح باتیں کرنے والے طوطے کی آواز پہلی بار سن رہا ہوں۔‘‘

’’میاں ! میں تمھارے سامنے ضرور آتا— لیکن — چھوٹے ہوئے تو کیا ہوا، ہو تو انسان— پتہ نہیں تم مجھے قید کر ڈالو یا مار ڈالو۔‘‘

’’ارے نہیں نہیں طوطے میاں ! تم یقین کرو ایسا نہیں ہوگا۔‘‘ شارق نے طوطے کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد دھیرے سے سبز رنگ کا طوطا، چاندکی روشنی میں پھڑ پھڑا کر شارق کے عین سامنے والی بوسیدہ دیوار پر آ بیٹھا۔

گہری سرخ چونچ اور گردن پر سیاہ و سنہری کنٹھی، بڑا خوبصورت طوطا تھا۔ جسے دیکھ کر شارق کی آنکھیں چمک اُٹھی اور وہ خوش ہوکر کہنے لگا:

’’شکریہ طوطے میاں! تم نے مجھ پر بھروسہ کیا اور

اپنے آپ کو میرے سامنے لے آئے۔ طوطے میاں یقین جانو میں چاہ کر بھی تمھیں پکڑ نہیں سکتا۔"

طوطے نے شارق کو گہری نظروں سے دیکھا اور کہنا شروع کیا: "— میں جس طرح انسانوں کی زبان بول سکتا ہوں، سمجھ سکتا ہوں، اِسی طرح ہر پرندے کی زبان میں بات کرسکتا ہوں، اُن کی باتوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ میاں! مجھے ہر روز ہر طرح کے پرندوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ تقریباً سب ہی پرندوں کا کہنا ہے کہ آج کا انسان بڑا خودغرض و مفاد پرست ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے عیش و عشرت کے لیے جنگل کاٹ کر اپنے لیے بستیاں بسائیں، اِن بستیوں میں آسمان سے باتیں کرتی عالیشان بلڈنگیں تعمیر کی لیکن ہم ننھے منے پرندوں کے گھونسلے برباد کردیے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو طوطے میاں؟" شارق نے طوطے کو مزید کہنے سے درمیان میں ہی روک دیا اور اپنی بات جاری رکھی: "یہ سچ ہے کہ انسان نے بہت ترقی کی، بلڈنگیں بنائی لیکن پرندوں کے گھونسلے توڑ کر۔ وہ کیسے؟"

"ارے میاں! جب جنگل کاٹے گئے تو جنگل کے درختوں پر پرندوں کے گھونسلے برباد نہیں ہوئے کیا؟" طوطے نے جھنجھلا کر کہا: "اور تو اور اپنی سہولت کے لیے موبائل فون اور فون کے ٹاوروں کو کھڑا کردیا، جس کی شعاعوں سے ہم پرندوں کی نسلوں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔" طوطا کچھ دیر رکا تاکہ اپنے غصے کو ٹھنڈا کرسکے پھر اپنے لہجے کو نرم کرتے ہوئے بولا: "کچھ پرندے ایسے بھی مجھے ملے جس نے اپنے آباواجداد سے سنا تھا، پرانے زمانے کے انسان پرندوں کے حق میں بہت اچھے تھے۔ وہ لوگ ہم معصوم پرندوں کی خدمت کرنے کو عبادت سمجھا کرتے تھے۔ اپنے گھروں کی چھتوں پر خاص کر دانے پانی کا انتظام کرتے تھے۔ اپنے آنگن میں اِس مقصد سے پھل دار درختوں کو لگاتے تھے تاکہ پرندے اِن درختوں پر بسیرا کریں۔" طوطے نے کہتے کہتے ایک سرد آہ بھری اور گردن اونچی کر کے رات کے سناٹے و نیم تاریکی میں ڈوبی بستی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا: "کیا بتاؤں میاں! ایسے کئی پرندوں نے بڑے غمگین ہو کر مجھ سے کہا۔ آج کا انسان بڑا خودغرض ہو گیا ہے۔ وہ اپنی فصلوں و پھلوں کو کیڑے مکوڑوں اور پرندوں سے بچانے کے لیے اس پر زہریلی دواؤں کا چھڑکاؤ کرنے لگا ہے، جس کی وجہ سے ہماری رہی سہی نسلیں سمٹنے لگیں۔" طوطا کہتے کہتے اپنی بات کو درمیان میں ہی اِس لیے روک دیا کہ شارق نہ جانے کن خیالوں میں کھو گیا تھا۔ طوطے نے شارق کے گرد اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر ایک چکر کاٹا تو شارق خیالوں سے باہر آیا اور شرمندہ ہو کر طوطے کو دیکھنے لگا۔

"کیوں میاں! کس دنیا میں چلے گئے تھے؟" طوطے نے چہک کر کہا۔

"کچھ نہیں مجھے گرما کی وہ دھوپ یاد آگئی۔ جب انھوں نے میری امی سے پانی مانگا تو امی نے اُن کے سامنے بسلیری کے پانی کی بند بوتل رکھ دی جسے میرے دادا نے الٹا پلٹا کر دیکھا اور میری امی سے کہنے لگے: 'کیوں بیٹے یہ بوتل کا پانی کیوں؟' تو انھوں نے کہا تھا: 'ابا جان! گزشتہ آٹھ دن سے نلوں میں پانی نہیں آیا اِس لیے بازار سے یہ پانی کی بوتلیں خریدنی پڑیں۔' تو دادا جان نے کہا تھا: 'اللہ رحم کرے۔ وہ نیکی جس کا اللہ کے قریب کوئی مول نہیں اُسے آج کے انسان نے بوتلوں

میں بند کر کے چند روپیوں میں بیچنا شروع کر دیا۔''

''اچھا طوطے میاں! اب میں چلتا ہوں میرے انکل اور پھوپھو مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ سنو طوطے میاں! کل صبح اپنے دوستوں کو میرے پھوپھو کے گھر ضرور لانا۔'' کہتے ہوئے شارق بستی کی جانب دوڑ پڑا۔

دن کا اجالا پوری طرح سے پھیلا نہیں تھا کہ شارق کی پھوپھو کے کانوں سے چڑیوں کی آوازیں ٹکرانے لگی تو انھوں نے نیند سے بھری آواز میں کہا:

''شارق میاں! اگر اُٹھ گئے ہو تو دیکھو دروازے پر کوئی کال بیل بجا رہا ہے۔'' لیکن کافی دیر تک کال بیل کی آواز پھوپھو کے کانوں میں گونجتی رہی تو وہ خود جھنجھلا کر اٹھ کر آنگن میں آئی تو آنگن کا ماحول دیکھ کر حیران ہوگئی۔ دروازے پر کال بیل نہیں بج رہی تھی بلکہ پورا آنگن کئی پرندوں سے بھرا ہوا تھا اور جا بجا شارق نے کنڈوں میں پانی و دانہ بھر کر رکھا تھا۔ پھوپھو مارے خوشی کے جھوم اُٹھیں اچانک قریب کی دیوار سے آواز آئی: ''السلام علیکم پھوپھو۔''

پھوپھو نے حیران ہوکر دیوار کی جانب دیکھا تو دیوار پر طوطے میاں کو بیٹھا پایا۔ شارق نے مسکرا کر کہا:

''یہ طوطے میاں ہیں، وہی طوطے میاں جس کو پنجرے والی نانی ڈھونڈا کرتی ہیں۔''

دفعتاً کال بیل بج اٹھی جس کی آواز سن کر پرندے پھڑ پھڑا کر اِدھر اُدھر اڑنے لگے۔ پنجرے والی نانی اپنے ہاتھ میں پنجرہ لیے گھر میں گھس آئی تھی کہنے لگی: ''ہمارا طوطا تمھارے پاس آیا کیا؟''

''ہاں نانی آیا ہے۔'' شارق نے نانی کو طوطے میاں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو پہلی بار نانی کی ویران آنکھوں میں چمک اور اداس ہونٹوں پر مسکراہٹ اٹمڈ آئی۔ وہ پنجرہ لے کر آگے بڑھی تو شارق نے اُن کے ہاتھ سے پنجرہ لے کر دور پھینکتے ہوئے کہا:

''نانی پرندوں سے محبت پنجروں میں نہیں اُن کی دیکھ بھال سے ظاہر ہوتی ہے۔''

طوطے میاں نے نانی کے ہاتھ سے دور پھینکے گئے پنجرے کو دیکھا اور اُڑ کر نانی کے سر پر آ بیٹھا جسے نانی لے کر باہر نکل گئی۔

■

Shaikh Husain
Sikandar Park, Maqsood Colony
Aurangabad - 431001 (Maharashtra)
Mob.: 9325774703
firdosqureshi.ff@gmail.com

جواب

1	گلاب	2	Surface Tension کی وجہ سے	3	639	4	بانو مشتاق
5	بحرین	6	کلوزڈ سرکٹ ٹیلی ویژن	7	29 اگست	8	برف
9	ناگپور	10	ENIAC	11	جام جہاں نما	12	کیلا
13	کاربن مونو آکسائڈ	14	ہمنگ برڈ	15	پنامہ	16	4 جنوری 1643، انگلینڈ
17	یوروپ	18	1928	19	تھرمامیٹر	20	The Kestrel (شکرا)

کہانی

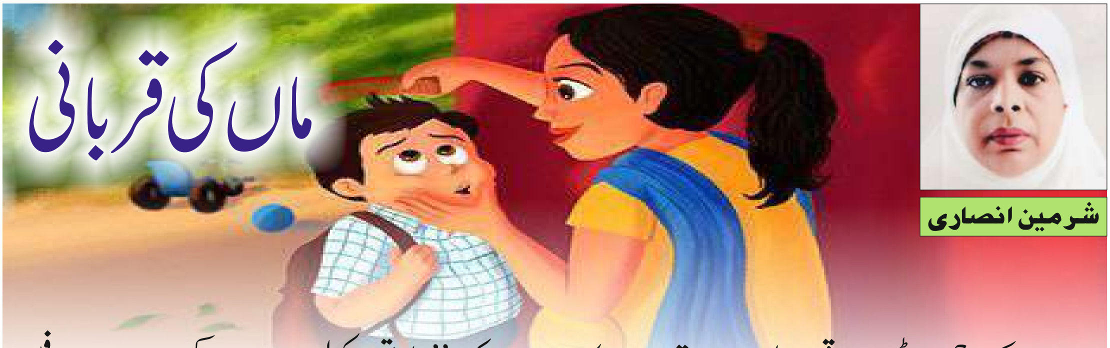

ماں کی قربانی

شرمین انصاری

حسن ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتا تھا۔ اس کا خواب بہت بڑا تھا، مگر گھر کے حالات بہت خراب تھے۔ والد کا سایہ بچپن میں ہی اٹھ گیا تھا۔ ماں، سکینہ بی بی، ایک سادہ سی، نیک دل، محنتی خاتون تھیں۔ سلائی مشین ہی ان کی دنیا تھی، اور بیٹا ہی ان کی کل کائنات۔ انھوں نے اپنے خوابوں کو بیٹے کی کتابوں میں بند کر دیا تھا۔ اپنی خوشیوں کو بیٹے کے خوابوں کے لیے قربان کر دیا تھا۔ کئی بار ان کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے، آنکھوں میں نیند کی کمی سے حلقے بن گئے، مگر چہرے پر ایک عزم، ایک دعا، اور ایک ماں کی نرم مسکراہٹ ہمیشہ قائم رہی۔

حسن اسکول میں ہمیشہ اوّل آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ایک ناکامی، اس کی ماں کی پوری زندگی کی محنت کو مٹی میں ملا سکتی ہے۔ جب دوسرے بچے کھیلتے، وہ کتابیں کھول لیتا۔ وہ صرف محنت نہیں کرتا تھا، وہ اپنی ماں کے آنسو پونچھنے کے خواب دیکھتا تھا۔ وہ ڈاکٹر بن کر ماں کو آرام دینا چاہتا تھا۔ ماں کو ایک بڑا سا گھر دینا چاہتا تھا، جہاں کوئی بل جمع نہ ہو، کوئی پانی کی موٹر نہ خراب ہو، کوئی چھت ٹپکتی نہ ہو، اور کوئی چپل بار بار سلائی نہ کرنی پڑے۔

ایک دن اسکول سے آ کر اس نے اپنی ماں کو روتے دیکھا۔ ہاتھ میں فیس کی پرچی تھی اور پرس خالی۔ ماں نے اسے کہا: ''بیٹا، تم اسکول مت جانا، کچھ دن بعد جب فیس جمع کرائیں گے تب جانا۔'' حسن کو لگا جیسے زمین کھا گئی ہو۔ وہ چپ چاپ اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گیا۔ اگلے دن جب اسکول گیا، تو فیس جمع تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ سکینہ بی بی نے اپنی شادی کی چوڑیاں گروی رکھ دی تھیں، جنھیں انھوں نے اپنے شوہر کی آخری نشانی سمجھ کر سنبھال کر رکھا تھا، آج بیٹے کے خوابوں کی خاطر قربان کر دی تھیں۔

دن گزرتے گئے، حالات سخت سے سخت تر ہوتے گئے، لیکن ماں کا حوصلہ کبھی کم نہ ہوا۔ جب حسن نے بارہویں جماعت امتیازی نمبروں سے پاس کیا، تو پورا محلّہ حیران رہ گیا۔ اس کا میڈیکل انٹرنس ٹیسٹ بہت قیمتی تھا۔ فارم، کوچنگ اور آنے جانے کا خرچ... سب کچھ ایک عام سلائی مشین کے دائرے سے باہر تھا۔ مگر ماں نے تھکنا نہیں سیکھا تھا۔ رات کو کپڑے سیتی، دن کو محلے کی بچیوں کو مہندی لگاتی، چھوٹے بچوں کو ٹیوشن دیتی، اور جو جوڑ پاتی، اس سے بیٹے کے خوابوں کو رنگ دیتی۔

جب حسن کا داخلہ سرکاری میڈیکل کالج میں ہو گیا، تو وہ دن اس کی ماں کے لیے عید سے بڑھ کر تھا۔ اس دن ماں نے پہلی بار اپنے لیے نئے کپڑے سلے، لیکن اسے پہننے کی نوبت نہ آئی۔ حسن پڑھنے شہر چلا گیا۔ ماں ہر مہینے

تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے بیٹے کو بھیجتی رہی۔ خود دال پانی پر گزارا کیا، لیکن کبھی شکایت نہ کی۔

پانچ سال گزر گئے۔ حسن اب ڈاکٹر بن چکا تھا۔ اسے پہلی تنخواہ ملی، تو اس نے سب سے پہلے ماں کے لیے تحفے خریدے۔ ایک شاندار شال، چاندی کی چوڑیاں، اور ایک خوبصورت دوپٹہ۔ راستے میں وہ سوچتا رہا کہ اب ماں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ اب وہ ہر دکھ کا بدلہ خوشی سے دے گا۔

لیکن جب وہ گھر پہنچا، دروازہ بند تھا۔ کئی بار دستک دی، کوئی جواب نہ آیا۔ جب دروازہ کھولا، تو ماں اپنے بوسیدہ پلنگ پر لیٹی تھیں۔ چہرے پر سکون تھا، آنکھیں بند تھیں، جیسے کسی خواب میں ہو۔ دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی، پاس ہی سلائی مشین تھی، اور ایک چھوٹا سا خط۔

خط میں لکھا تھا:

"میرے بیٹے حسن،

تم نے وعدہ نبھایا۔ اب ماں خوشی خوشی سو سکتی ہے۔

تمھاری کامیابی میری زندگی کی مکمل کہانی ہے۔

کبھی کسی ماں کی قربانی کو معمولی نہ سمجھنا،

کیونکہ وہ اپنے خواب بیچ کر تمھارے لیے تقدیر خریدتی ہے۔"

حسن کے ہاتھ سے وہ چوڑیاں، شال، اور دوپٹہ زمین پر گر گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا، وقت کو پلٹانا چاہتا تھا، صرف ایک بار ماں کے قدموں میں بیٹھنا چاہتا تھا، انھیں سب کچھ دینا چاہتا تھا... لیکن دیر ہو چکی تھی۔ اب صرف خاموشی تھی، یادیں تھیں، اور ایک سلائی مشین۔

آج اس کی پہچان ایک کامیاب شخص کے طور پر تھی، اس کی شہرت بھی ہر طرف تھی، مگر مگر اس کی ماں کا کمرہ ویسا ہی بوسیدہ تھا، فرق صرف یہ تھا کہ اب وہاں ماں نہیں تھی۔

کامیابی اس وقت ادھوری رہ جاتی ہے جب ہم اسے ان کے ساتھ نہ بانٹ سکیں جن کی دعاؤں اور قربانیوں سے وہ کامیابی ممکن ہوئی۔ ماں صرف جنم نہیں دیتی، وہ قدم قدم پر زندگی دیتی ہے، اپنے حصے کی خوشیاں نچھاور کر کے، اپنے خواب جلا کر۔

ہم اکثر اپنی مصروف زندگی میں ان ہاتھوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جنھوں نے ہمیں تھام کر چلنا سکھایا تھا۔ ہم وہ آوازیں بھول جاتے ہیں جو راتوں کو جاگ کر ہمارے امتحانوں کی دعائیں مانگتی رہیں۔ ہم ان آنکھوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جنھوں نے ہمیں ہمیشہ مسکراتے دیکھنے کی خواہش رکھی، چاہے ان کی اپنی آنکھوں میں آنسو کیوں نہ ہوں۔

حسن کی کہانی ہم سب کے لیے ایک آئینہ ہے۔ اس میں ہماری ماں ہے، ہماری خواہشیں، اور ان کے خواب۔ ہمیں ان کے جیتے جی ان کا مقام دینا ہوگا، ورنہ بعد میں ہمارے پاس صرف آنسو ہوں گے، اور ایک بے آواز سلائی مشین۔

■

Dr. Sharmeen Ansari
Shad Adam Shaikh Teck High School
& Junior College, 518 Nizampur
Pinjra Pole
Bhiwandi- 421302 (Maharashtra)
Mob.: 9323524281
sharmeentarique@gmail.com

کہانی

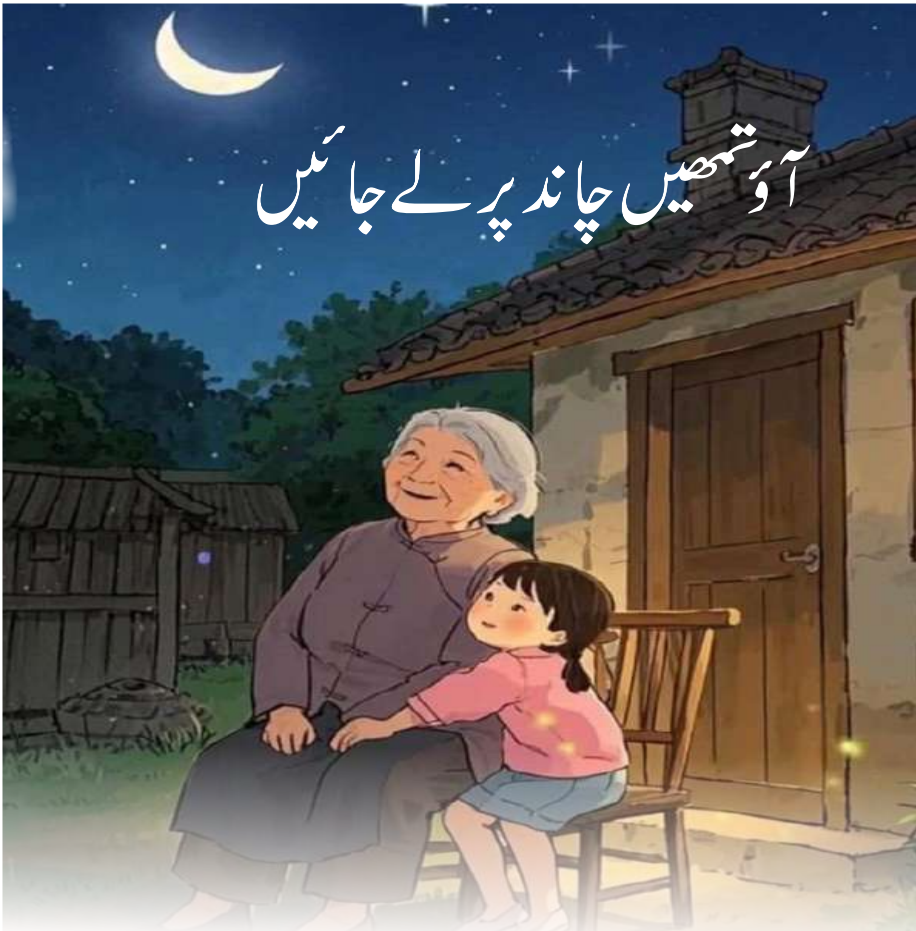

آؤ تمھیں چاند پر لے جائیں

گل افشاں

پیارے بچو! آپ نے اپنی دادی اماں نانی اماں یا اپنی امی جان سے یہ گیت تو بچپن میں سنا ہی ہوگا۔

چندہ ماما رے آؤ پارے آؤ
ندیا کنارے آؤ
چاندی کی کٹوری میں
دودھ بھات لیتے آؤ۔

میں نے بھی یہ گیت سن رکھا ہے، آج میں اسی چندہ ماما کے یہاں آپ کو لے کر چلوں گی۔ کیا آپ لوگ چندہ ماما کے یہاں جانے کو تیار ہیں؟ ان کے ہاں کیا کیا چیزیں دیکھنے کو ملیں گی؟ اس کا شوق آپ لوگ رکھتے ہیں۔ سبھی بچوں نے جواب دیا ”ہاں“

تو بچو! آیئے ہم چلتے ہیں چندہ ماما کے سفر پر۔ ام حبیبہ، نور فاطمہ، رستم، رضوان اور اشرف آپ سبھی خلائی جہاز میں چل کر سوار ہوں، اپنا اپنا خلائی لباس پہن لیں، ٹیچر نے بچوں کو ہدایت دی، بچے نہایت جوش سے بھرے تھے۔

”ایک بچے نے پوچھا زمین سے چاند کتنا دور ہے؟“

”بہت اچھا سوال ہے، بچوں کو اسی طرح سوال پوچھنا چاہیے“ چاند ہماری زمین سے تین لاکھ 84 ہزار کلومیٹر دور ہے۔ اگر ہم خلائی جہاز اسپیس کرافٹ میں

بیٹھ کر چاند پر جائیں تو چار دن بعد ہم چاند کی زمین پر پہنچیں گے'' چار دن لگ جائے گا؟ ام حبیبہ نے حیرت سے کہا، کیا اتنا لمبا سفر؟ نور فاطمہ نے ٹکڑا لگایا؟ ''مس آپ آگے بتائیے'' اشرف نے کہا ''ہاں تو سنو! جیسے ہی ہم چاند کی زمین پر اتریں گے یہاں آپ کو بڑے بڑے گڑھے دکھائی دیں گے اور وہاں کی زمین بھی اونچی نیچی نظر آئے گی'' ٹیچر نے بتایا۔

''ایسا کیوں؟'' ام حبیبہ، رستم رضوان اور اشرف نے پوچھا۔

''یہ میں تمھیں بعد میں بتاؤں گی، پہلے یہ جان لو کہ چاند پر اترنے کے بعد جب آپ اوپر کی طرف دیکھیں گے تو آپ کو ایک خوبصورت سیارہ دکھائی دے گا، یہ وہی سیارہ ہے جہاں سے آپ آئے تھے'' یعنی ہماری زمین ہے نا ٹیچر؟ ام حبیبہ اور رستم نے ایک آواز میں کہا ''بالکل صحیح سمجھا واہ بھائی ہمارے بچے تو بڑے ہوشیار ہیں'' ٹیچر نے شاباشی دی۔ ہاں یہ ہمارا اپنا سیارہ زمین ہے جانتے ہو، بچو چاند سے زمین کی طرف دیکھنے پر زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی نظر آئے گی لیکن یہ آپ کو ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی دکھائی دیتی رہے گی۔ اگر آپ چاند پر کھڑے ہو کر زمین کو کئی سالوں تک دیکھتے رہیں تو بھی یہ اپنی جگہ پر ٹھہری ہوئی ہی دکھائی دے گی۔

اب ہم بات کریں گے چاند کے کشش ثقل کی یعنی (Gravitational force) کی یہ زمین کے مقابلے چھ گنا کم ہے'' اس کا کیا مطلب ہے ٹیچر؟'' سبھی بچوں نے دریافت کیا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ چاند پر پہنچنے کے بعد ہمارا وزن چھ گنا گھٹ جائے گا اسے اس طرح سمجھو کہ زمین پر آپ کا وزن اگر 60 کلو ہے تو چاند کی زمین پر اترتے ہی وزن کم ہو کر 10 کلو ہو جائے گا۔''

''ایسا کیوں ہوتا ہے'' بچوں نے سوال داغا۔ دراصل چاند پر کرہ ہوا نہیں ہے اس لیے دباؤ نہیں ہوتا۔ ٹیچر نے وضاحت کی۔

خلائی جہاز ایک جھٹکے کے ساتھ رک گیا، ٹیچر نے بچوں کو بتایا کہ اب آپ چاند کی سرزمین پر اتر چکے ہیں یہاں آپ خود کو کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ ٹیچر نے بچوں سے پوچھا۔

''ہم لوگ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہے ہیں'' صحیح کہا۔ آپ کا وزن چھ گنا کم ہو گیا ہے، آپ یہاں آسانی سے ادھر ادھر چل سکتے ہیں، جب چاند پر قدم رکھنے والے پہلے خلاباز چاند پر چل رہے تھے تب وہ بھی اچھل اچھل کر چل رہے تھے۔

''اس پہلے خلاباز کا کیا نام تھا ٹیچر؟'' بچوں نے پوچھا۔

''بہت اچھا سوال کیا آپ نے؟ اس خلاباز کا نام تھا نیل آرم اسٹرانگ، دوسرے کا نام تھا بس ایلڈرن اور تیسرے کا نام تھا مائیکل کولنگ۔ 1969 میں اپولو 11 خلائی جہاز سے تین خلاباز (Astronauts) چاند پر گئے تھے۔ نیل آرمسٹرانگ (Neil Armstrong) پہلے خلاباز تھے جنھوں نے چاند کی زمین پر قدم رکھا، مائیکل کولن وہ خلاباز تھے جو چاند پر نہیں اترے، وہ اپنے راکٹ میں بیٹھے چاند کے مدار (Orbit) میں گردش کرتے رہے۔

چاند پر اب تک جتنے بھی خلاباز گئے ہیں ان سبھی کے قدموں کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ ''ایسا کیوں؟'' بچوں نے پوچھا ''کیونکہ چاند پر ہوا اور پانی نہ

کہانی

ہونے کی وجہ سے نشان جیسے تھے وہ اسی طرح قائم ہیں۔ اب آپ چاند پر قدم رکھ چکے ہیں چلنے کی کوشش کیجیے۔''

''ٹیچر ہم لوگ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہے ہیں ایسا لگتا ہے ہم ہوا میں تیر رہے ہیں'' رستم، نور فاطمہ، ام حبیبہ اشرف اور رضوان سبھی نے کہا ''یہاں ہوا نہیں ہے یہاں آپ لوگوں کا Gravitational force کم ہو گیا ہے، اسی لیے آپ کو محسوس ہو رہا ہے کہ اپ تیر رہیں'' ٹیچر نے سمجھایا۔

بچے ادھر ادھر اچھلتے ہوئے چل رہے تھے، تھوڑی دور چلنے پر انھیں کچھ ٹوٹی پھوٹی چیزیں بکھری نظر آئیں، سبھی بچے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، یہ کوڑا کچرا یہاں بھی پھیلا ہے؟'' ٹیچر نے بتایا یہ ہم انسانوں کے کارنامے ہیں جس طرح زمین پر ہم انسان کچرا ادھر ادھر پھینک دیتے ہیں اب چاند کی زمین کو بھی ویسا ہی کرنے کی شروعات ہے، کچروں کے بیگ خلائی مشین کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اور خراب پڑے ہوئے مصنوعی سیاروں کے ٹوٹے پھوٹے آلات چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے یہ سب کچرا ہم انسانوں کی ہی دین ہیں۔ ان کچروں کی تعداد یا مقدار اتنی ہے کہ پانچ ٹرک آسانی سے بھرے جاسکتے ہیں۔''

''ٹیچر! ابھی انسان یہاں آباد نہیں ہوئے ہیں تو اتنا کوڑا چھوڑ گئے اگر یہاں آباد ہو جائیں تو کیا حال ہوگا؟'' ام حبیبہ اور نور فاطمہ نے حیرت سے پوچھا ''تم نے صحیح سوچا ہے ہمیں اپنی عادت میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے'' ٹیچر نے بچوں سے کہا۔

''آیئے بچو! آپ کو چاند پر کچھ خطرات کے بارے میں سمجھائیں ہم سب بہت دیر سے چاند کی زمین پر گھوم رہے ہیں لیکن یہاں ایک بڑا خطرہ بھی ہے؟'' کیسا خطرہ اور کس سے؟'' بچوں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔ ''گھبرایئے نہیں سمجھیے یہاں آپ کو سب سے بڑا خطرہ آسمانی موت کا ہے۔ جی ہاں آسمان سے آنے والی موت جیسا آپ سبھی جانتے ہیں چاند کا اپنا کوئی کرہ ہوا نہیں ہے، اس کے نہ ہونے کے سبب یہاں پر شہاب ثاقب (comet) کے آنے کا ڈر رہتا ہے، اگر کوئی انسان چاند کے کسی حصے پر کھڑا ہے اور پتہ نہیں کب کوئی شہاب ثاقب جو بڑے پتھر کی شکل میں ہوتا ہے، اچانک آسمان سے آکر انسان کو موت کا شکار بنا دے گا۔''

''ایسا؟'' بچے حیرت کے ساتھ خوفزدہ بھی تھے۔

''ہاں ایسا ہی ہے۔'' ٹیچر نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''بچو! آپ نے پوچھا تھا نا کہ چاند پر یہ گڑھے کیسے بنے ہیں؟ تو سنو ان پتھروں کے گرنے سے ہی بڑے بڑے گہرے گڑھے بن گئے ہیں، آپ نے زمین سے چاند کو دیکھا ہے ہمیں وہاں کیا دکھائی دیتا ہے؟'' ٹیچر نے سوال کیا۔

رستم بولا ''ہمیں چاند پر کالے کالے دھبے نظر آتے ہیں۔''

''دراصل وہ کوئی دھبے نہیں یہ گڑھے ہیں اور اتنے گہرے ہیں کہ یہاں سورج کی روشنی بھی نہیں پہنچ پاتی ہے، اسی لیے یہ ہمیں کالے دھبے کی شکل میں نظر آتے ہیں، جب ہم زمین سے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں آسمان نیلے رنگ کا دکھائی دیتا ہے لیکن جب انسان چاند سے آسمان کو دیکھتا ہے تو یہ کالے رنگ کا دکھائی دیتا

ہے، مطلب یہ ہوا کہ آپ جب بھی چاند سے آسمان کی طرف دیکھو گے تو ایک سیاہ آسمان نظر آئے گا۔'' بہت دیر سے ہم چاند پر کھڑے ہیں اس لیے اکتاہٹ محسوس ہو رہی ہے لیکن میں آپ کو اس ماحول سے باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ لوگ موبائل تو لائے ہوں گے؟'' ٹیچر نے پوچھا۔

''جی ہاں ٹیچر''

''تو نکالیے اپنا اپنا موبائل اور انٹرنیٹ کا مزہ لیجیے۔''

''یہاں سے بات ہوسکتی ہے؟'' رضوان اور اشرف نے حیرت سے پوچھا۔

''بالکل ہوسکتی ہے، آپ کو بتا دوں کہ امریکی خلائی ایجنسی NASA نے چاند پر Wi Fi کی سہولت فراہم کرا دی ہے اور اپنے نام ورلڈ ریکارڈ بنا لیا ہے، چاند کا یہ Wi Fi 19MBPS تک کی رفتار دیتا ہے اب آپ لوگوں کا دل تو چاہ رہا ہوگا اپنے گھر والوں اور دوستوں سے بات کروں؟''

''جی ہاں ٹیچر آپ نے صحیح اندازہ لگایا'' نور فاطمہ، ام حبیبہ، اشرف، رستم اور رضوان سبھی نے ایک آواز میں کہا۔ بچوں نے اپنے گھر والوں کو فون لگایا اور گھنٹی بھی بجنے لگی لیکن یہ کیا....؟ بچے لگاتار بولے جا رہے ہیں لیکن ان کی آواز باہر نکل ہی نہیں رہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ چاند پر کرہ ہوا نہیں ہے اس لیے آواز کا موومنٹ ممکن نہیں ہے۔ پھر چاند پر جانے والے خلاباز مخصوص لباس پہن کر جاتے ہیں۔ اس میں آکسیجن اور نائٹروجن گیس بھر کر مصنوعی طور پر ہوا کا دباؤ بنایا جاتا ہے اور لباس میں ایک مائیکروفون لگا رہتا ہے جس کی مدد سے خلاباز کسی سے بھی باتیں کرسکتے ہیں۔

چاند کے سفر کے لیے یہاں پر ہونے والے دن اور رات کے متعلق اچھی طرح جاننا بھی ضروری ہے، چاند زمین کا ایک چکر لگانے میں 29.5 دن کا وقت لیتا ہے اور اس کے خود کے محور پر چکر لگانے میں اتنا ہی وقت لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں زمین سے چاند کا صرف ایک ہی رخ نظر آتا ہے دوسرا رخ ہمیشہ چھپا رہتا ہے، چاند کا ایک دن قریب 14 دن کا ہوتا ہے اور رات بھی تقریباً اتنی ہی لمبی ہوتی ہے چاند پر رات بہت ٹھنڈی ہوتی ہے، یہاں کا درجہ حرارت -c133- ہوتا ہے جبکہ دن کا درجہ حرارت 121c تک ہوتا ہے، سائنس دانوں کے مطابق چاند کے جنوبی کتب دن میں بھی ٹھنڈا رہتا ہے مگر راتیں برفیلی ہوتی ہیں جیسے جیسے رات گہری ہوتی جاتی ہے درجہ حرارت بھی کم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اب تک جتنے بھی خلاباز چاند پر گئے وہ چاند کے شمالی کتب پر ہی گئے۔

''ارے اٹھوگی یا سوئی ہی رہوگی۔ تمھارے اسکول جانے کا وقت ہونے کو ہے آج چھٹی پر رہنا ہے کیا؟ یہ کیا بڑبڑا رہی ہو چاند کا سفر درجہ حرارت، امی نے جھک جھور کر جگا دیا اور وہ خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آگئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی اور تیار ہوکر اسکول کے لیے روانہ ہوگئی یہ سوچتے ہوئے کہ آج بچوں کو چاند کے سفر کے بارے میں پڑھاؤں گی.!!

■

Gul Afshan Khatoon
Jamey Ashraf Oriental School, Kachocha
Ambedkar - 224155 (UP)
Mob.: 7380955166
parwezashrafi1955@gmail.com

کہانی

فیضان اور اونٹ

شاداب ابراہیم

فیضان کے اسکول میں گرمی کی چھٹی ہوئی، چھٹی میں ریگستانی علاقہ کی سیاحت کا پروگرام اسکول کے منتظمین نے بنایا، اکثر بچوں نے جانے کی خواہش ظاہر کی، رخصت کرنے کے لیے ان کے والدین بھی آئے، بس میں سوار ہوکر بچے راجستھان کے ایک ریگستانی علاقے کی طرف روانہ ہوئے، بس میں اساتذہ نے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہا: ریگستانی علاقے میں پانی کی شدید قلت ہوتی ہے! لہٰذا تم لوگ پانی ضرورت کے حساب سے ہی استعمال کرنا۔

کیا ریگستانی علاقے میں بارش نہیں ہوتی ہے؟

بچوں نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا:

بارش کم ہوتی ہے! اساتذہ نے جواب دیا۔

بات ختم ہوگئی، بچے بس کی کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر باہر دیکھ رہے تھے، اونٹوں کی قطاریں تھیں، عورتیں سروں پر مٹکا لیے راجستھانی لباس میں نظر آرہی تھیں، سورج غروب ہورہا تھا، آسمان صاف تھا، ریتیلی زمین تھی جس پر گھاس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی، پھر بھی منظر سہانا تھا اور نظارہ دلربا تھا۔

بس ہوٹل پہنچی، بچوں نے کپڑے تبدیل کیے، کھانے کا وقت ہوچکا تھا، کھانا کھایا، دن بھر کی تھکان تھی، نیند جلدی آگئی صبح اساتذہ نے بچوں کو جگایا اور تیار ہونے کے لیے کہا، بچے جلدی جلدی تیار ہوکر ناشتے سے فارغ ہوگئے، اساتذہ نے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہا: تم میں سے ہر کسی کو پانی کی ایک ایک بوتل دی جائے گی، اس کی حفاظت تمھیں خود کرنا ہے، پانی زیادہ مت ضائع کرنا، یہاں پانی کی شدید قلت ہے!

بس ہوٹل سے نکلی، بچے آپس میں گفتگو کرنے لگے اور تصویر لینے کے لیے اپنے اپنے کیمرے تیار کرنے لگے،

سورج ابھی پورے طور سے نمودار بھی نہیں ہوا تھا لیکن تپش کافی بڑھ چکی تھی، پیاس بھی لگ رہی تھی، بچے بوتل کھول کھول کر پانی بھی پی رہے تھے، فیضان بھی لاپرواہی سے پانی پی رہا تھا، اچانک بوتل ہاتھ سے چھوٹ گئی، پورا پانی گر گیا۔

بس متعینہ مقام پر پہنچی، بچے اپنی اپنی تصویر لینے لگے، فیضان نے بھی ایک دو تصویر لی لیکن بہت جلد ہی پیاس سے اس کا حلق خشک ہونے لگا، ایک جگہ بیٹھ گیا، پھر اٹھا، ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، پانی کی تلاش میں لیکن پانی نظر نہیں آیا، وہ بیٹھ گیا، پیاس کی شدت بڑھتی جا رہی تھی، وہ سکون سے بیٹھ نہیں پا رہا تھا، پھر اٹھا، ہر طرف نظر دوڑائی، دور صحرا میں پانی کے چمکنے کا احساس ہوا، پانی کی امید سے اس نے قدم بڑھانا شروع کیا،

ہر بڑھتے قدم کے ساتھ اس کی امید ٹوٹتی گئی، وہ پانی نہیں سراب تھی، مایوس ہو کر بیٹھ گیا، ایک اونٹ دور سے فیضان کی اس حرکت کو دیکھ رہا تھا، وہ فیضان کے پاس آیا۔

ارے بچے! تم سراب کے پاس آئے تھے؟ اور دھوکہ کھا گئے کیا؟ اونٹ نے کہا

ہاں! بھائی! مجھے بہت تیز پیاس لگی ہوئی ہے! میں پانی کی تلاش میں آیا تھا! فیضان نے جواب دیا۔

وہ پانی نہیں! سراب ہے! انسان دھوکہ کھا جاتے ہیں! میں بھی دھوکہ کھا گیا! فیضان نے جواب دیا۔

کیا..... تمھارے پاس پانی نہیں ہے.....؟

پانی تھا..... مگر گر گیا!!! فیضان نے کہا۔

کیسے گرا؟ لگتا ہے..... تم نے لاپرواہی کی ہے!

ہاں!.....ہاں!..... میری لاپرواہی کی وجہ سے ہی پانی گرا ہے..... فیضان نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

ریگستان میں تمھیں اتنی آسانی سے پانی نہیں مل پائے گا، تمھیں پانی کی حفاظت کرنی چاہیے تھی!..... مجھے دیکھو! میں کس طرح سے پانی بچا بچا کر اپنے پیٹ میں رکھتا ہوں.....!

تم پانی بچا کر اپنے پیٹ میں کیسے رکھ لیتے ہو؟ فیضان نے تعجب سے پوچھا۔

ہاں!.....ہاں!..... میں پانی بچا بچا کر اپنے پیٹ میں رکھتا ہوں اور ضرورت پڑنے پر ہی استعمال کرتا ہوں..... فضول خرچی اور لاپرواہی سے کام نہیں لیتا ہوں.....!

کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ فیضان نے بہت زیادہ حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

ہاں! ہاں! میں سچ کہہ رہا ہوں! تم سے جھوٹ بول کر میرا کیا فائدہ ہوگا.....؟ اسی وجہ سے مجھے پانی کے لئے کبھی بھی پریشان نہیں ہونا پڑتا ہے۔

اگر یہ بات ہے تو اب میں بھی صرف پانی ہی نہیں ہر چیز کی حفاظت کروں گا۔ فضول خرچی سے بچوں گا، لاپرواہی سے کام نہیں لوں گا اور ضرورت پڑنے پر ہی استعمال کروں گا تا کہ مجھے بھی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، فیضان نے اونٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

■

Shadab Ibrahim
At. & Po. Bauram Via Biraul Ps. Jamal Pur
Distt. Darbhanga - 847203 (Bihar)
Mob: 9304786489
Ibrahimmdshadab786@gmaiil.com

نئی اڑان

وسیم جیلانی

جھیل پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔اسی گاؤں میں فرزین نام کا ایک لڑکا رہتا تھا۔فرزین کا تعلق ایک غریب مزدور خاندان سے تھا۔اس کے ماں باپ گھر چلانے کے لیے بڑی محنت کرتے تھے۔

فرزین اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ اکثر خوابوں کی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔وہ اپنی ماں سے اکثر کہتا ”امی! میں پریوں کے شہر جانا چاہتا ہوں،صرف ایک دن کے لیے!“

ماں ہنستے ہوئے جواب دیتی۔

”بیٹا! اگر تم دل لگا کر پڑھو گے تو ایک دن تمھارے سب خواب پورے ہوں گے۔“

فرزین کی دادی بھی اسے سمجھاتی۔

”بیٹا! تمھارے امی ابو چاہتے ہیں کہ تم ایک بڑا آدمی بنو۔وہ تمھارے روشن مستقبل کے لیے بہت محنت کر رہے ہیں۔“

لیکن فرزین ان باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔

وہ پانچویں جماعت کا طالب علم تھا، لیکن اسے اسکول اور پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اسی وجہ سے وہ اپنی جماعت میں سب سے پیچھے رہ گیا تھا۔وہ نہ تو اپنے ساتھی بچوں سے میل جول رکھتا اور نہ ہی اسکول کی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد اسکول کے امتحان کا نتیجہ آ گیا۔

جب اس کی استانی نے اس کا نام پکارا تو افسوس بھرے لہجے میں کہا ”فرزین! تم اس سال ناکام ہو گئے ہو۔تم جماعت کے واحد طالب علم ہو جو فیل ہوئے ہو۔“

یہ خبر سن کر فرزین بہت افسردہ ہوا۔اسے شرمندگی محسوس ہوئی۔اسے احساس ہوا کہ اس کی لاپروائی نے گھر کے سب لوگوں کی امیدوں کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

وہ گہری سوچ میں گم ہو گیا۔اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ گھر جا کر کیا کہے گا۔سب اسے ضرور ڈانٹیں گے، خاص طور پر امی، ابّو اور دادی جان۔وہ سب یہ خبر سن کر بہت دکھی ہوں گے۔

گھر جاتے ہوئے فرزین مسلسل یہی سوچتا رہا۔ اسے اب یہ بات سمجھ میں آ چکی تھی کہ امتحان میں ناکامی کی ذمے داری اسی کی ہے۔اسے اپنے رویّے پر بہت افسوس ہو رہا تھا،مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

جیسے ہی یہ خبر اس کے گھر والوں کو ملی،اس کے امی، ابو اور خاص طور پر دادی نے ناراضگی کا اظہار کیا۔گھر کے سبھی لوگوں نے اسے ڈانٹا۔فرزین سب کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔

امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھا، اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے کہ اچانک اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

نیند میں اس نے خود کو پریوں کے شہر میں پایا۔ وہاں ایک خوبصورت پری نے اسے اپنے محل کی سیر کرائی۔ محل کی دیواریں سونے اور چاندی کی بنی ہوئی تھیں اور چاروں طرف حسین باغات تھے۔ پری نے شفقت سے کہا۔

"فرزین! تم میرے بیٹے جیسے ہو۔ تمھاری اسکول میں ناکامی نے تمھارے والدین کو بہت دکھ پہنچایا ہے۔ وعدہ کرو کہ آئندہ تم اپنی پڑھائی پر پوری توجہ دو گے اور ایک اچھے انسان بنو گے۔"

فرزین نے وعدہ کیا کہ وہ دل لگا کر پڑھائی کرے گا اور اپنے والدین کو کبھی مایوس نہیں کرے گا۔ آئندہ وہ ہرگز لاپروائی کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔

پری نے خوش ہو کر کہا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی، فرزین!"

پھر اس نے اسے پرستان کے جنگلوں کی سیر کرائی، آسمانوں کی بلندیوں تک لے گئی اور دوبارہ محل میں واپس لائی۔

پری نے نرمی سے کہا۔

"بیٹا! میری ہدایت پر عمل کرنا۔ اپنی پڑھائی پر خاص توجہ دینا اور ایک بہتر انسان بننا۔ اپنے والدین کے خوابوں کو حقیقت بنانا۔"

آخر میں پری نے مسکرا کر کہا۔

"میری نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھنا۔"

اگلی صبح جب فرزین کی آنکھ کھلی تو اس کے دل میں ایک نیا عزم تھا۔ اب وہ باقاعدگی سے اسکول جانے لگا اور دل لگا کر پڑھائی کرنے لگا۔ اس کی محنت رنگ لائی، اور اسی سال وہ جماعت میں اوّل نمبر سے کامیاب ہوا۔ اس کے والدین خوشی سے نہال ہو گئے۔ گھر کے تمام افراد اسے دعائیں دینے لگے۔ یہ سب کے لیے خوشی کا لمحہ تھا۔

فرزین نے سیکھا کہ محنت اور توجہ سے ہی خوابوں کو حقیقت میں بدلا جا سکتا ہے۔ اس کے خواب نے اسے زندگی میں ایک نیا راستہ دکھایا اور وہ ایک کامیاب اور ذمہ دار طالبِ علم بن گیا۔

محنت، لگن اور توجہ سے ہی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

خواب تبھی پورے ہوتے ہیں جب ہم ان کے لیے سنجیدگی سے محنت کریں۔

والدین کی خواہشات اور قربانیوں کی قدر کرنا ہماری ذمے داری ہے۔

ناکامی مایوسی نہیں، بلکہ خود کو بہتر بنانے کا موقع ہوتی ہے۔

اپنی غلطیوں کا اعتراف اور ان کی اصلاح کرنا ہی کامیابی کی طرف پہلا قدم ہے۔

اسی عزم سے فرزین نے بھی خود کو بدلا اور کامیابی اس کا مقدر بنی۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ محنت کرنے والوں کی کبھی ہار نہیں ہوتی۔

■

Waseem Ahmed Khan Jeelani Khan
Kalekhanipura Jamdar Plot
At Post: Balapur, TQ: Balapur
Distt: Akola - 444302 (MS)
Mob.: 9922871571
waseemahemadkhan82@gmail.com

احرار حسین

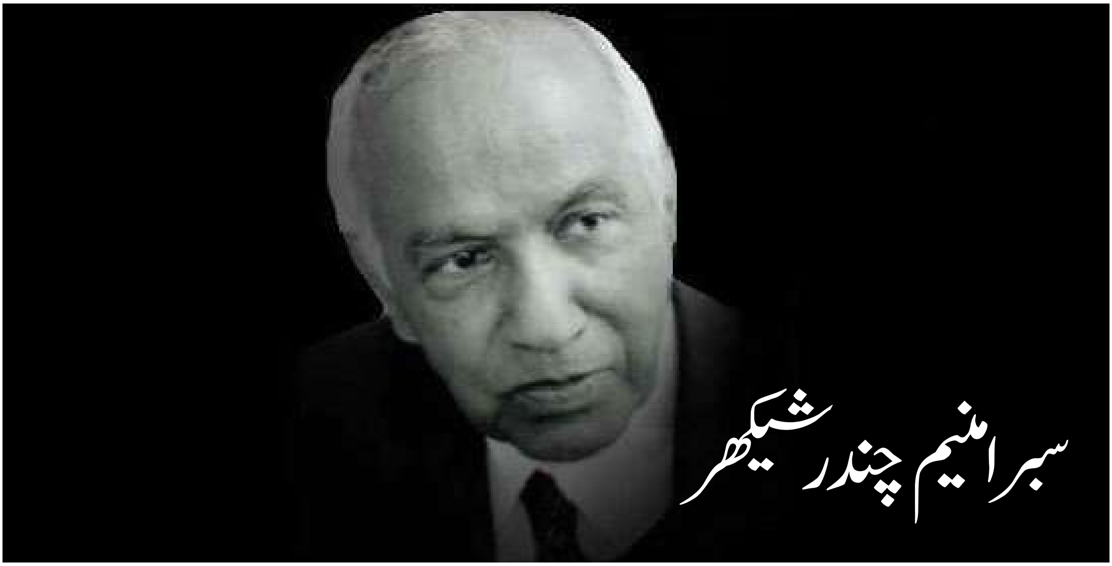

سبرامنیم چندر شیکھر (Subrahmanyan Chandrasekhar) 9/اکتوبر 1910 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدراس کے ہندو ہائی اسکول اور پریسی ڈینسی کالج میں ہوئی۔ انھوں نے 1930 میں مدراس یونیورسٹی سے ایم۔اے پاس کیا۔ پھر پی ایچ ڈی کے لیے کیمبرج یونیورسٹی تشریف لے گئے۔ 1933 میں اس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کیمبرج کے قیام کے دوران سبرامنیم چندر شیکھر نے تاروں کے وجود میں آنے اور ان کے فنا ہونے کی تھیوری کو سمجھنے کی کوشش کی اور وہ اس تحقیقی کام میں کامیاب بھی ہوئے۔ سبرامنیم چندر شیکھر نے اپنے تحقیقی کام کو اس وقت کے ماہروں کے سامنے پیش کیا۔ ان سائنسدانوں نے سبرامنیم کے کام میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی اور ان کے کام کو مسترد کر دیا۔ مشہور ماہر نجوم ڈاکٹر ای ڈنگلٹن نے سبرامنیم کا مذاق بھی اڑایا اور چندر شیکھر سے وہ تمام کاغذات جس پر چندر شیکھر نے رپورٹ لکھی تھی لے کر پھاڑ بھی دیے۔

چندر شیکھر اس ذلت سے کسی طرح مایوس نہیں ہوئے بلکہ ان کا عقیدہ اپنے تحقیقی کام پر اور زیادہ مضبوط ہوا۔ انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی تحقیق میں مصروف ہو گئے۔

ڈاکٹر چندر شیکھر کا خیال تھا کہ ختم شدہ تارے کے الیکٹرانس کی رفتار روشنی کے برابر ہوتی ہے، اس لیے عظیم سائنسداں البرٹ آئنسٹائن کی اسپیشل تھیوری آف ریلیٹیوٹی سے مضبوط ہونا چاہیے۔ وہ یہ خیال رکھتے تھے کہ اڈنگٹن اور روپ فاؤلر جیسے سائنسدانوں کے خیالات غلط ثابت ہوں گے۔ اس لیے آئنسٹائن کے نظریات پر دھیان دیا جانا چاہیے۔ انھیں 1933 میں ٹرینٹی کالج کیمبرج یونیورسٹی کا فیلو منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر چندر شیکھر نے 11 جنوری 1935 کو لندن میں منعقد ایسٹروفزیکل سوسائٹی کی ایک میٹنگ میں تاروں کی بناوٹ اور ان کے وجود میں آنے اور تباہ ہو جانے کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ تباہ ہونے والے تاروں میں جو مادہ موجود ہوتا ہے وہ سورج کے مادے سے 1.4 گنا زیادہ ہوتا ہے،

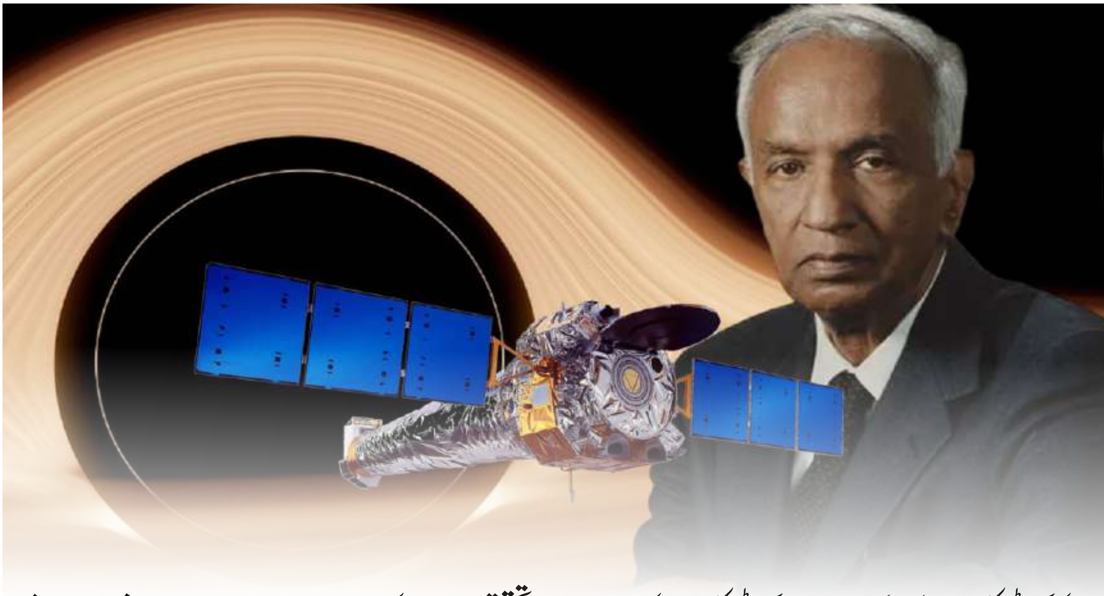

جس کو کریٹیکل ماس کہا گیا اور ماس کریٹیکل مس کو چندر شیکھر لمٹ کے نام سے جانا گیا، لیکن وہ تارے جن کا مادہ اس سے کم ہوتا ہے، اپنا سب ایندھن ختم کر دینے کے بعد کشش کے سب ٹھوس مادے میں تبدیل ہو جاتے ہیں، جس کو وہائٹ دوارف کہا جاتا ہے، لیکن وہ تارے جن کا وزن کریٹیکل ماس سے زیادہ ہوتا ہے ختم ہوتے ہوتے ٹھوس مادے میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور ان کی جسامت چھوٹی ہو جاتی ہے، انھیں ہول کہا جاتا ہے۔ چندر شیکھر کے اس نظریے کو انگریز ماہر نجوم نے تسلیم نہیں کیا۔ تھوڑے وقت کے لیے چندر شیکھر مایوس بھی ہوئے، لیکن وہ ناامید نہیں ہوئے۔ اس لیے انھوں نے کیمرج یونیورسٹی چھوڑ کر 1938 میں شکاگو جانا پسند کیا۔ اسی دوران چندر شیکھر نے ہندوستان میں نوکری تلاش کرنی بھی چاہی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ 1944 میں آپ شکاگو یونیورسٹی میں علم نجوم کے پروفیسر منتخب ہوئے۔ وہ دنیا کے کئی ممالک تشریف لے گئے اور اپنے تحقیقی مقالوں کو سائنسدانوں کے سامنے پیش کیا۔ آخیر میں شکاگو یونیورسٹی میں مستقل رہائش قبول فرمائی۔ اس درمیان علم نجوم کے سائنسداں چندر شیکھر کے تحقیقی کاموں کو تسلیم کرنے لگے۔ ڈاکٹر چندر شیکھر نے اپنے تحقیقی کاموں کو کتاب کی شکل بھی دی جس کا نام انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈیز آف اسٹیلر اسٹرکچر رکھا۔ اس کتاب کا بڑا حصہ آپ نے اسٹروفزیکل جرنل میں شائع کرنے کے لیے بھیجا، لیکن جرنل کے مدیر نے اس کو چھاپنے سے انکار کر دیا، لیکن ان کو اپنی غلطی کا احساس جلد ہی ہو گیا اور مدیر نے ڈاکٹر چندر شیکھر کو سرونگ ایڈیٹر بنایا۔ آپ اس جرنل کے مدیر 1952 سے 1972 تک رہے۔ ڈاکٹر چندر شیکھر کے تحقیقی کاموں پر نوبیل کمیٹی نے تحقیق کے پچاس سال بعد سنہ 1983 کا نوبیل انعام سے ڈاکٹر چندر شیکھر کو نوازا۔ دیر آید درست آید۔ والی بات صحیح نکلی اور چندر شیکھر نے دنیا والوں سے اپنا لوہا منوا ہی لیا۔ نوبیل انعام چندر شیکھر کو ملنے والے انعامات میں سب سے بڑا انعام تو تھا، لیکن

آپ کو زندگی میں علم نجوم اور دوسرے سائنسی کارناموں کے لیے بھی انعامات سے نوازا جاتا رہا۔ 36 سال کی عمر میں آپ کو شکاگو یونیورسٹی میں علم طبیعیات کے لیے پروفیسر مقرر کیا گیا۔ 1952 میں پیسیفک علم نجوم سوسائٹی نے سونے کا تمغہ دیا۔ 1953 میں رائل ایسٹرونامیکل سوسائٹی نے گولڈ میڈل دیا۔ 1957 میں امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنس نے رم فورڈ میڈل سے بھی نوازا۔ اس کے بعد 1962 میں رائل سوسائٹی لندن نے رائل میڈل سے نوازا۔ پھر 1967 میں ڈاپلر انعام ملا۔ انھوں نے 1971 میں نہرو میموریل پر بھی لکچر دیا۔ اس طرح ان انعامات کے علاوہ چندر شیکھر کو دوسرے انعامات بھی ملتے رہے اور اس طرح ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہا۔

عالمی شہرت یافتہ چندر شیکھر کی نجی زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو ایک بڑا ہی سیدھا سادھا انسان علم طبیعیات کی ریاضی گتھیاں کتنی آسانی سے حل کرلیا کرتا تھا۔ ان کی زندگی میں محنت لگن اور ان کی ذہانت کا ہی دخل تھا۔ ان کے نزدیک جو بھی آتا وہ ان کی زندگی اور خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کا تحقیقی کام کرنے کا الگ ہی ڈھنگ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ صرف ایک ہی تحقیق سے مطمئن نہیں ہوتا ہوں بلکہ ایک انکشاف کے بعد دوسرے انکشاف کی طرف متوجہ ہوجاتا ہوں۔ وہ 84 سال کی عمر میں بھی اپنے روزمرہ کے کام خود کیا کرتے تھے اور تقریباً 12 گھنٹے کا وقت تحقیقی کاموں میں صرف کیا کرتے تھے۔ عظیم سائنسداں پروفیسر فلپ موریسن نے چندر شیکھر کے کارناموں کو تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا کہ ڈاکٹر چندر شیکھر کا کام ہندوستان کے سائنسدانوں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

چندر شیکھر کو اپنا کام پورا کرنے کے لیے ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ اپنے کام کو تسلیم کرانے کے لیے انگلینڈ میں بھی کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، جس کی وجہ سے وہ دنیا بھر میں گھومتے رہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنے ملک کے ذہین سائنسدانوں کو نہیں پہنچانتے ہیں، یا جان بوجھ کر پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ہمارے ملک کے اچھے ذہن رکھنے والے سائنسداں دوسرے ممالک میں جاکر اپنا تحقیقی کام پورا کرتے ہیں اور اس کو عالمی سطح پر تسلیم بھی کرواتے ہیں۔ اس کا سبب شاید ہمارے ملک میں وہ مواقع اور وہ ماحول ابھی تک سازگار نہیں ہوسکا ہے، جو اعلیٰ پیمانے کی سائنسی تحقیق کے لیے درکار ہے۔ ملک کا نظام چلانے والوں کے سامنے یہ سوال ہے کہ ان ذہین سائنسدانوں کو کس طرح اپنے ہی ملک میں سائنسی تحقیق کرنے کے لیے مواقع دستیاب کریں اور کس طرح ہم ان سائنسدانوں کی حوصلہ افزائی کرسکیں۔

چندر شیکھر 21 اگست 1995 کو دل کے دورہ کے سبب انتقال فرماگئے۔ ان کی موت سے ہمارے ملک نے ایک عظیم اور ہونہار سائنسداں کھودیا تھا۔ دنیا بھر کی سائنس برادری ان کی سائنسی خدمات کو کافی دنوں تک یاد رکھے گی اور بھلا نہ سکے گی۔

■

ماخذ: عظیم سائنسداں (مع ترمیم واضافہ)
مصنف: احرار حسین، **تیسری طباعت:** 2016
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محمد خلیل

کیلے کی غذائی اہمیت

کیلے کا اصل وطن ایشیا کے گرم اور مرطوب علاقے ہیں۔ یہ زمانہ قدیم سے ہی پیدا ہوتا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ عرب میں ہندوستان سے پہنچا اور پھر یہاں سے افریقہ اور دوسرے ساحلی علاقوں تک کا سفر کیا۔ عام طور پر یہ گرم علاقوں میں پیدا ہوتا ہے۔ قدیمی چینی علوم میں بھی کیلے کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔

کیلا ہمارے ملک کا مشہور پھل ہے۔ اس کی کاشت کے خاص علاقے صوبہ بنگال اور مہاراشٹر ہیں جن میں کثیر تعداد میں پیدا کیا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں 270000 ہیکٹر رقبے میں اس کی کاشت ہوتی ہے اور تقریباً 45000 فی ہیکٹر اسے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا تنا ستون جیسا ہوتا ہے اور پرت در پرت ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی عام طور پر دس سے چالیس فٹ تک ہوتی ہے، جب اس کا درخت ایک سال کا ہو جاتا ہے، اس وقت پھل آنا شروع ہوتے ہیں اور پھر یہ موٹی پھلیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے بعد ہم انھیں گچھے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ اس کے بیج چکنے گودے میں اس طرح ملے ہوتے ہیں کہ استعمال کے دوران اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ عام طور پر کیلے کے گچھے (گیل) کو کیلا پکنے سے پہلے ہی کاٹ لیتے ہیں۔ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں پکنے میں کچھ وقت لگتا ہے اور اسی دوران اس میں جراثیم داخل ہو جاتے ہیں اور پھر یہ استعمال کے قابل نہیں رہتے۔ اس لیے اس طرح توڑ کر پکاتے ہیں۔ کیلے کی متعدد اقسام ہیں لیکن رنگ کے اعتبار سے ہرے چھلکے کے، زرد رنگ کے اور چتی دار بہت مشہور ہیں اور ہر کوئی پسند کرتا ہے۔

کیلا غذائیت اور لذت کے اعتبار سے تمام غذائی پھلوں میں امتیاز رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے ہر شخص

کھانا پسند کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا پھل ہے جس میں تین چوتھائی غذائی اجزا موجود ہیں۔ایک اندازے کے مطابق کیلے میں کیلشیم کی مقدار تقریباً 17 ملی گرام ہے، فاسفورس کی مقدار 36 ملی گرام ہے، لوہے کی مقدار تقریباً 0.9 ملی گرام ہے، حیاتین (وٹامن) بھی اس میں تقریباً ملی گرام تک موجود ہیں۔ اس میں پروٹین اور کاربوہائیڈریٹس کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ میگنیشیم، گندھک، سوڈیم میگنیز، تانبا اور نمکیات کی مقدار بھی خاص ہوتی ہے۔ کیلے میں ان مفید اجزا کی موجودگی سے اسے ایک مکمل پھل کہا جا سکتا ہے۔ اس میں موجود کاربوہائیڈریٹس (نشاستہ) اور پروٹین (لحمیہ) بدن کی پرورش میں معاون ہیں اور ساتھ ہی بدن میں حرارت اور قوت پیدا کرتے ہیں۔ حیاتین بھی اس میں کثیر مقدار میں موجود ہیں۔ اس میں حیاتین (ا، ب، ج) موجود ہونے سے یہ بچوں کے لیے نہایت مفید ہے اور نشو و نما میں مدد کرتا ہے اور ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے۔ اس میں موجود حیاتین ب ہاضمہ کی قوت کو بڑھاتا ہے۔ حیاتین ’ج‘ ہڈیوں کو طاقت دیتے ہیں۔

کھانے کے اعتبار سے پکے ہوئے کیلے سب سے زیادہ مناسب ہیں۔ زرد رنگ کے چتی دار کیلے نہایت لذیذ اور مفید ہوتے ہیں۔ اگر کیلوں کو دودھ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس کی غذائیت میں اضافہ ہو جاتا

ہے۔ کیلا کسی قدر قابض اور دیر سے ہضم ہوتا ہے، لیکن جن لوگوں کا معدہ قوی ہوتا ہے ان کو قبض نہیں کرتا۔ اس کے برابر استعمال سے بدن کو طاقت ملتی ہے اور بدن موٹا ہوتا ہے۔

کیلوں کا استعمال صبح کے وقت مناسب نہیں ہے۔ اس سے نظام ہضم میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کا استعمال کھانا کھانے کے بعد یا سہ پہر کو بطور ناشتہ استعمال کیا جائے۔ ہر شخص کی قوت ہضم مختلف ہے۔ اس طرح پانچ یا چھ کیلو سے زیادہ کھانا کسی بھی شکل میں مناسب نہیں، وہ بھی ایک تندرست آدمی کے لیے۔

کیلے کی اہمیت ادویاتی نقطۂ نظر سے کچھ کم نہیں۔ انیمیا کے مریضوں کو کیلا دیا جاسکتا ہے اور ان کے لیے یہ ایک عمدہ غذا ہے۔ کیلا پیچش میں بھی مفید ہے۔ بعض اوقات اس کے استعمال سے پیچش میں فوری طور پر فائدہ پہنچتا ہے اور کیلے کے گودے کو سرکہ یا لیموں کے رس میں ملا کر لیپ کرنے سے کھجلی اور سر کے گنج کو فائدہ پہنچتا ہے اور کیلے کے گودے کے ساتھ خربوزے کے بیج کو پیس کر آپس میں ملا کر لگانے سے جلد کا رنگ صاف ہوتا ہے۔ اس طرح یہ داغ اور دھبے دور کرنے میں نہایت کارآمد ہے۔ کیلے کی جڑ کو جوش دے کر پلانے سے آنتوں کے کیڑے مر جاتے ہیں۔ کیلے کے پتوں کو جلا کر ان کا نمک حاصل کیا جاتا ہے جو بلغمی کھانسی اور دمہ میں مفید ہے۔ کیلے کی آئس کریم اور اس کی تیار کی ہوئی متعدد میٹھی اشیا تو ہر کوئی بڑے شوق سے کھانا پسند کرتا ہے۔

چونکہ کیلے نشاستہ اور شکر سے بھرپور ہیں اور اس کی غذائیت ٹھوس ہے۔ اس لیے بعض لوگوں کو کیلے سے قبض ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اس کے استعمال کے بعد الائچی کھائی جائے تو کیلا جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں یہ قد میں اضافہ کرتا ہے، اس کے استعمال سے دانت مضبوط اور سفید ہوتے ہیں۔ اس کا استعمال سبزیوں میں بھی ہوتا ہے۔ کیلے میں کئی ایسے اجزا موجود ہیں جو کیلے کے استعمال سے ہمارے خون میں شامل ہو جاتے ہیں، جس سے خون میں ایک عجیب سی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خوشبو مچھروں کو بے حد پسند ہے۔ کہتے ہیں کھٹمل بھی اس کو پسند کرتا ہے اس طرح اس کا استعمال مچھر اور کھٹمل کو دعوت دیتا ہے۔

کیلا مختلف سماجی رسم و رواج کا بھی ایک حصہ بن گیا ہے۔ شادی اور پوجا میں اس کا چھوٹا درخت لا کر سجاوٹ کے طور پر لگایا جاتا ہے اور اسے اچھا عمل قرار دیا جاتا ہے۔ جسم کو قوت دینے میں ایک کیلا دس بادام، ایک سیب، ڈیڑھ پاؤ دودھ یا سات اونس سنترے کے رس کے برابر ہے۔ اس سے اس کی غذائی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس طرح کیلے کے فائدے ہماری روزمرہ کی زندگی میں حیرت انگیز طور پر مفید ہیں، جنھیں عام طور پر استعمال کرتے ہوئے بھی سوچتے نہیں کہ یہ کس قدر اہم ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ کیلا ہماری اچھی صحت کے لیے ایک مکمل غذا ہے اور اس کا کوئی حصہ غیر ضروری نہیں ہے۔

■

Mohammad Khalil
H-51, Dr. Iqbal Lane
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات

معلوماتِ عامہ بچوں کے کیریئر اور مستقبل سازی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جنرل نالج پوری دنیا سے جوڑنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اسی کے ذریعے مسابقہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں، اس لیے بچے اگر ابھی سے تاریخ، ادب وثقافت، سماج اور سائنس کے موضوعات اور معلومات پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو مستقبل میں ان کے لیے راہیں آسان ہو جائیں گی۔

1. پھولوں کا بادشاہ کسے کہا جاتا ہے؟
2. پانی کا قطرہ گول کیوں ہوتا ہے؟
3. انسانی جسم میں کتنے عضلات ہیں؟
4. 2025 کا انٹرنیشنل بکر پرائز کسے دیا گیا؟
5. موتیوں کا جزیرہ کسے کہتے ہیں؟
6. CCTV کا فل فارم کیا ہے؟
7. قومی کھیل ڈے کب منایا جاتا ہے؟
8. وہ کون سی چیز ہے جسے نہ تو آگ جلا سکتی ہے اور نہ ہی پانی ڈبو سکتا ہے؟
9. ہندوستان کے کس شہر کو سنترے کا دارالحکومت کہا جاتا ہے؟
10. دنیا کے سب سے پہلے کمپیوٹر کا نام کیا ہے؟
11. اردو کے سب سے پہلے اخبار کا نام بتائیں؟
12. ایسا کون سا درخت ہے جس میں لکڑی نہیں ہوتی ہے؟
13. گاڑی چلنے کی وجہ سے جو زہریلی گیس پیدا ہوتی ہے اسے کیا کہتے ہیں؟
14. وہ کون سا پرندہ ہے جو اڑ تو سکتا ہے مگر چل نہیں سکتا؟
15. کس ملک میں ایک سال میں دو مرتبہ یوم آزادی منایا جاتا ہے؟
16. نیوٹن کب اور کہاں پیدا ہوا؟
17. وہ کون سا براعظم ہے جس میں صحرا نہیں ہے؟
18. ہاکی میں انڈیا نے پہلا اولمپک گولڈ میڈل کب جیتا تھا؟
19. درجہ حرارت ناپنے کے لیے کون سا آلہ استعمال کیا جاتا ہے۔
20. کون سا پرندہ ہے جو ہوا میں ٹھہر سکتا ہے؟

(جواب صفحہ نمبر 42 پر ملاحظہ فرمائیں)

سیدہ روحینہ، درجہ یازدہم، مہاراشٹر

پرتیک، درجہ یازدہم، اکبرپور، باروٹہ، سونی پت، ہریانہ

بھومی، درجہ پنجم، پی ٹی، کے آر ودیا مندر، سمالکا، پانی پت، ہریانہ

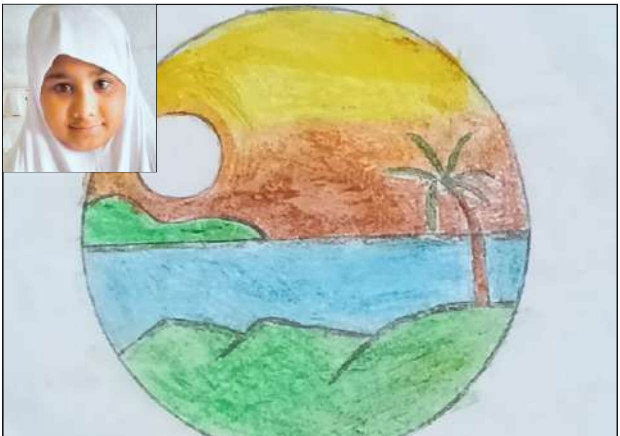

عالیہ بی شیخ عرفان، درجہ ششم، گورنمنٹ اردو نیو مڈل اسکول، شاہ پور، ضلع برہانپور، ایم پی

محمد ریان، درجہ پنجم، نیو ہورائزن اسکول، نظام الدین، دہلی

میسرہ رحمت علی، سن رائز ہائی اسکول، مرادنگر، حیدرآباد، تلنگانہ

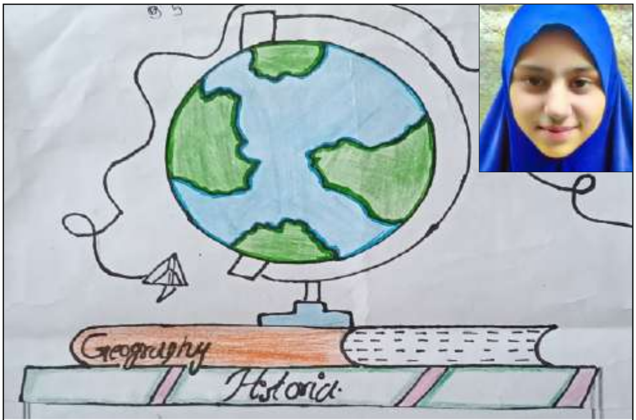

الفیہ بی آصف خان، درجہ ہفتم، گورنمنٹ اردو نیو مڈل اسکول، شاہ پور، ضلع برہانپور، ایم پی

رمیشہ ثمین محمد علیم، درجہ دہم، ناندورہ، ضلع بلڈانہ (مہاراشٹر)

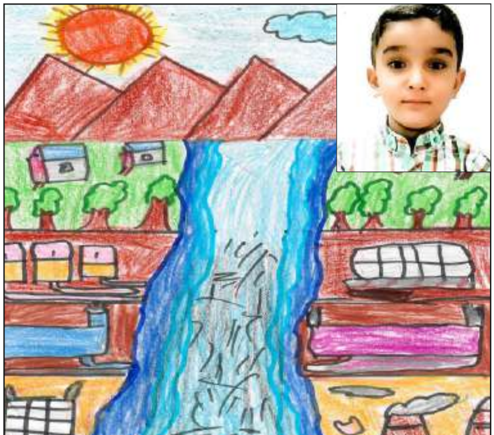

محمد ایان، درجہ دوم، نیو ہورائزن اسکول، نظام الدین، دہلی

عبدالباری، درجہ چہارم، نیو ہورائزن اسکول، نظام الدین، دہلی

حذیفہ انعم شیخ محمد، سید پورہ، بالاپور، ضلع آکولہ، مہاراشٹر

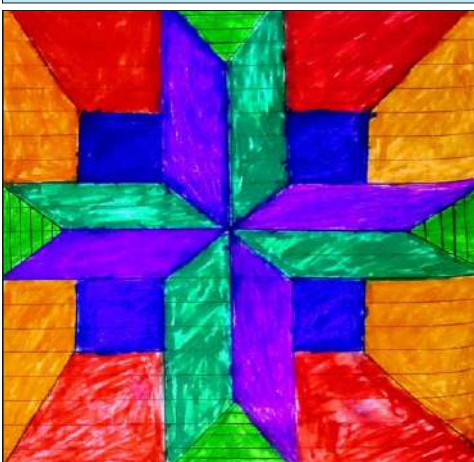

محمد عفان محمد شارق، درجہ ششم، دی مالیگاؤں ہائی اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹر

بشریٰ بی نعیم شاہ، درجہ نہم، گورنمنٹ اردو نیو مڈل اسکول، شاہ پور، ضلع برہانپور، ایم پی

فرحین بی نعیم شاہ، درجہ ہفتم، گورنمنٹ اردو نیو مڈل اسکول
شاہ پور، ضلع برہانپور، ایم پی

مریم سید کاظم الدین، درجہ چہارم، برڈیا انٹرنیشنل اسکول بودوڈ، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

تنزیلہ فردوس شیخ اسحاق، گورنمنٹ اردو ایچ ایس ایس، خیراتی بازار، برہانپور، مدھیہ پردیش

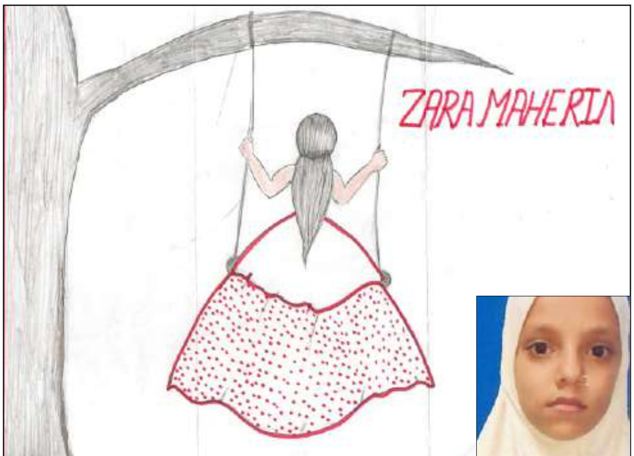

زارا مہرین شیخ مختار، درجہ ششم، عبدالرشید پرائمری و مڈل اسکول، ضلع آکولہ، مہاراشٹر

اسما باگلی، درجہ پنجم، لیڈ انگلش میڈیم پرائمری اینڈ ہائی اسکول، وجے پور، کرناٹک

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد وشمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, अगस्त 2025, वर्ष 13, अंक 08
BACHON KI DUNIYA Monthly, August 2025 Vol. 13, Issue: 08
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/07/2025
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

صفحات : 22، قیمت: 25 روپے

صفحات: 20 قیمت: 25 روپے

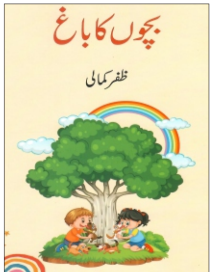

صفحات: 50، قیمت: 20 روپے

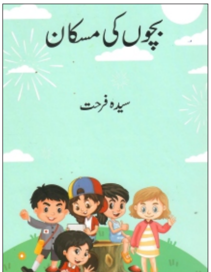

صفحات: 64، قیمت: 25 روپے

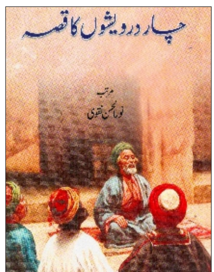

صفحات: 70، قیمت: 30 روپے

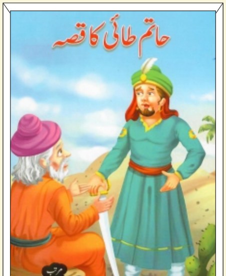

صفحات: 86 ، قیمت: 30 روپے

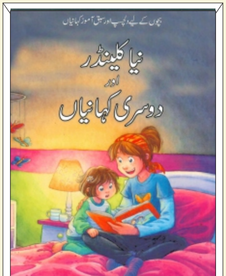

صفحات: 43، قیمت: 15 روپے

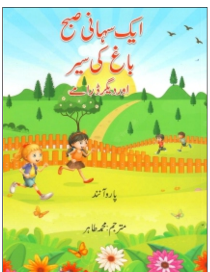

صفحات: 101، قیمت: 35 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B - 127, Sector 65, Noida, U.P
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.